بعد کو باہر لائے جاتے تھے اور پھر براہ راست یورپ کو بھیج دیے جاتے تھے۔

ہترا۔ دریائے ثرثر جبل سنجار سے نکل کر اُن خرابوں کے پاس سے گزرتا ہے جو اب تک زمانہ کی دست برد سے اس درجہ محفوظ ہیں کہ اُن کے مقابلہ کا کوئی خرابہ عراق میں مشکل سے ہوگا۔ یہ ہترا کا اُجڑا ہوا شہر ہے جو کسی زمانہ میں ایک وسیع چراگاہ کے وسط میں آباد سڑکوں سے بہت دور دائرہ کی شکل میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ بسایا گیا تھا۔ اُس زمانہ میں اس کو فن تعمیرات کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ شاہان ساسانیہ اپنے شاندار محلوں کے لئے جن سے اُن کی دولت اور سطوت کا اظہار ہوتا تھا معمار۔ کاریگر اور عمارتوں کے نقشے یہیں سے طلب کیا کرتے تھے۔ اس کو کھودنے کی بہت ہی کم ضرورت ہے اسلئے کہ قدیم اہل اسیریا کے آثار قدیمہ کے برعکس یہاں چٹانیں بہت کم ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خوبصورت شہر تھا تھوڑے ہی زمانہ قبل زلزلہ کے صدمہ سے غارت ہوا ہے نفیس سنگی دیواروں پر بیشمار منارے بنی ہوئی ہیں۔ وسط شہر میں ایک عالیشان محل کھڑا ہے جس کی دیواریں بجائے اینٹوں کے پتھر کے چوکور ٹکڑوں سے بنی ہیں۔ علاوہ بریں اور بہت سے مکانات ہیں جن کی دیواریں نقش و نگار اور تصویروں سے مزین ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ شہر سنہ عیسوی کی پہلی صدی میں آباد ہوا ہوگا اس شہر پر طراجان اور سویرس نے باری باری حملہ کیا تھا مگر دونوں فتح سے محروم رہے۔ دریائے ثرثر کا پانی بہت ہی تلخ ہے اور شور لیکن مہذب عربوں نے شیریں پانی کے لئے دوسرے وسائل ضرور بہم پہونچا لئے ہوں گے جس کا ثبوت اُن متعدد گہرے گہرے کنوؤں سے ملتا ہے جو یہاں اب بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ کنوئے اوپر سے تنگ اور نیچے سے چوڑے ہیں اور اب تو نصف کے قریب کنکر پتھر سے پٹ گئے ہیں۔ گو ہترا کے آثار قدیمہ کا شمار قدامت کے اعتبار سے اول درجہ کے آثار میں نہ ہو لیکن ہمیشہ سیاحوں کے لئے دلچسپی کا باعث بنے رہیں گے۔ شمار اور اسی طرح کے دوسرے عربی قبائل و عشائر کی تمبوٹیوں کے دلکش نظارے جو ہترا آتے جاتے ہوے سیاحوں کو ملیں گے وہ عراق کے اور کسی میں غالباً نہ پائے جائیں گے۔

ہیت۔ تل سفیرہ شمال مغرب کی طرف دریائے فرات کے کنارے اور دمشق

سے کچھ ہی فاصلہ پر ہیت کا مشہور قصبہ واقع ہے۔ جس کو قدیم زمانہ میں مختلف ناموں ایلا۔ اِس۔ اِہوا۔ اِہی ڈ قرہ وغیرہ سے پکارا جاتا تھا۔ اسی مقام سے اُس سڑک کے لئے جس کو بنوخدنصر نے اپنے جلوس کے لئے بابل میں تعمیر کرایا تھا پتھر اور سمینٹ آیا کرتا تھا۔ اس سے کچھ اور آگے شمال کی طرف مقام آلنہ میں پتھر کی کانیں ہیں۔ یہاں کا پتھر نہایت عمدہ قسم کا بلکہ اُسی نمونہ کا ہے جیسا کہ شارع بابل کے منقش سنگی علموں کا پتھر ہے۔ یہاں سے دیر اسیر جاتے ہوئے جبیریہ صالحیہ۔ اور خاصکر راہ بہ میں بہت سے خرابے ملیں گے جو قابل دید ہیں۔ دیر کے شمال میں سنجہ جاتے ہوئے جہاں پر عراق اور شریفہ کی سرحد ہے نہ نوبیہ کے آثار قدیمہ واقع ہیں۔

یوخہ ۔ (قدیم اُمّا) ۔ تل یوح سے شمال مغرب ۱۸۔۲۰ میل کے فاصلہ پر یوخہ کے آثار قدیمہ موجود ہیں۔ اصل ٹیلہ تقریباً نصف میل لمبا ہے۔ ۳۔۱۹۰۲ء میں ڈاکٹر اینڈرراے صاحب یہاں آئے تھے لیکن غالباً کھدائی کا کام نہیں شروع کیا۔ یہاں پر ایک وسیع عمارت اونا بھٹہ کی پکائی اینٹیں وغیرہ پائی جاتی ہیں۔

مدینۃ الخلفاء یعنی بغداد مشرق کے مشہور شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ گو اہیں ایسی یادگاریں بہت کم ہیں جو علم آثار قدیمہ کے نقطۂ خیال سے اہمیت کی حامل ہوں لیکن اس کے اطراف میں چند ٹیلے ضرور ہیں جہاں آثار قدیمہ مدفون ہیں۔ ان کے علاوہ ہارون الرشید کے محل اور شہر کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ مغربی جانب اکثر قدیم مکانات کے کھنڈرات ہیں جو اُن اینٹوں سے تعمیر ہوئے تھے جو بنوخدنصر کے مکانوں سے نکالی گئی تھیں اور جو بظاہر بابل سے یہاں لائی گئی تھیں اس کے علاوہ عیسائیوں کے محلہ کے قریب ایک قدیم منارہ ہے جو اب بالکل کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ اس کو ۶۲۵ھ میں خلیفہ مستنصر نے تعمیر کرایا تھا۔ اسی کے قریب ایک ٹوٹی پھوٹی کالج کی عمارت ہے جس کو کسی زمانہ میں ترکوں نے جنگی گھر بنا رکھا تھا شہر سے پچھم جانب ہارون الرشید کی لاڈلی بیوی ستیدہ زبیدہ کا مزار ہے۔ اور اسی سے ملا ہوا شیخ معروف کرخی کا مزار ہے جو گو غیر آباد لیکن اچھی حالت میں ہے۔

مثل ایران و افغانستان و عربستان و گجرات و پنجاب وغیرہم میں پھیل گئے اور مختلف ناموں سے ان کی ذاتیں بن گئیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں وہ ذات ہوئی جس کا دت نام ہوا۔ اسی بوہنار برہمنی نسل میں عالی جناب مہاراجگان بنارس بیتا ہوا ٹیکاری و راجہ صاحبان لال گولا و تکوہی وغیرہم ہیں۔

ہاشمی صاحب کی تحریر ہم کو بتلاتی ہے کہ بوہنار قوم فطرتی طور پر علم و ہنر و شجاعت و سیاحت سے دلچسپی لیتی تھی۔ شاعری و نثاری میں انھیں ذوق سلیم حاصل تھا مظلوم سے ہمدردی کرنا اور ظالم سے نفرت کرنا ان کی طبیعت ثانی تھی۔ ہاشمی صاحب لکھتے ہیں کہ ان میں کا ایک نمودار شخص گزرا ہے جس کو راہب کہا جاتا تھا اس کے سات فرزند تھے۔

جب واقعہ ہائلہ کربلا جب مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا اور وہ خون شہیدان کربلا کا دشمن سے بدلہ لینے کو اٹھے تو راہب کے فرزند بھی مسلمانوں کے شریک ہو گئے اور میدان کارزار میں فدائیان شبیر کے

سعادت حاصل کی۔ اس نظم کے نیچے الفاظ (باقی آئندہ) طبع ہیں۔ اغلب ہے کہ ۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کے بعد بھی ہاشمی صاحب نے اپنی تحقیق کی دوسری قسط بھیجی۔

بہر صورت جملہ مومنین و مبلغین سے میری عرض ہے کہ وہ مضمون ۸ ستمبر ۱۹۲۴ء اور مضمون یا مضامین مابعد کو تلاش کریں اور مزید تحقیق کریں۔ کیا عجب ہے کہ سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی ۱۳۶۱ھ کی تبلیغ میں بوہنار برہمنوں کی جاں نثاری بھی کچھ مدد دے سکے۔

تاریخ وفات حسرت آیات حضرت نجم الملۃ اعلی اللہ مقامہ

از سید لدار حسین صاحب اظہر

ہادی دین متیں رفت بفردوس بریں
رحلتش داد غم فرقت نجم الملۃ
معرفت گفت بتاریخ وفاتش اظہر
علم بیجاں شدہ از رحلت نجم الملۃ
۱۳۶۰ھ

برلن پر بد نقصان

لندن ۱۸ اپریل۔ لندن پر حملہ کے جواب گزشتہ شب برلن پر برطانوی طیاروں نے ش[illegible] حملہ کیا۔ برلن پر اس سے قبل اتنا سخت اور ز[illegible] حملہ نہ ہوا تھا۔ قلب شہر میں بڑے طاقتور بم [illegible] گرے جس سے یقیناً سخت نقصانات پہنچے ہوں گ[illegible] حملہ شروع ہوتے ہی برلن میں ادھر ادھر آگ [illegible] شروع ہو گئی۔

ناظرین فراز

آج کے پرچہ میں صفحہ ۱۵ کالم ۲ و ۳ پر اشتہار خاص سفارش ضرور ملاحظہ ہو قبلہ سنیا[illegible] صاحب نے ملک کے فائدہ کو مد نظر رکھتے ہوئے مزید رعایت کا اعلان فرمایا ہے۔

(منیجر)

عراق وحجاز کی سرزمین کو ہزارہا سال پہلے پیغمبروں اور رسولوں کے ورود اور فیوض کا شرف حاصل ہوا اور ان جگہوں کے چپہ چپہ میں قدیم تہذیب اور تاریخی آثار زیر خاک پنہاں اور بالائے زمین ہویدا ہیں۔ اسلام کی آمد سے پیشتر کے جو ایسے نشانات ہیں ان کو اختصار کے ساتھ اردو زبان میں کافی دلچسپ اور مفید اطلاعات کے ساتھ لکھنے کی زحمت شاید کسی نے نہیں فرمائی۔ زیادہ تر جن لوگوں نے ان سرزمینوں کی سیر کی وہ وہی لوگ تھے جنھوں نے مقامات مقدسہ کی زیارت کی اور گھر پلٹ آئے نہ ان کو علم نہ کوئی ان کو بتانے والا نہ کوئی کتاب جس سے ان کو قدیم آثار اور نشانات کا پتہ چلتا۔ اسلئے جب واپسی پر ان کو کچھ باتیں جو اس کتاب میں لکھی گئی ہیں کہیں سنی سنائی معلوم ہوتی ہیں تو ان کی حسرت اور افسوس کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ یہ کتاب مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور ہر قوم کے سیاح کیلئے عموماً بیحد مفید اور دلچسپ ہے جس کو مشرقی علوم کے ماہر جناب سید اطہر حسین صاحب جعفری نے بڑی تلاش اور محنت سے مختلف کتب اور اپنی سیاحت عراق وحجاز و مصر کے زمانہ میں ذاتی جستجو سے معلوم کرکے تحریر فرمایا ہے اور اردو داں پبلک پر احسان کرکے اس کو اخبار سرفراز میں چھپنے کیلئے مرحمت فرمایا۔ یہ مجموعہ انھیں حالات اور معلومات کا ذخیرہ ہے جو آج کتابی صورت میں پیش ہے۔

(ممتاز حسین جونپوری)

۱۷ر اپریل سنہ ۴۱ء

عراق کی مختصر تاریخ

عراق کی مختصر ترین قدیم تاریخ

(اور)

اس کے آثار قدیمہ

(تالیف)

سید اطہر حسین صاحب جعفری سابق پروفیسر السنہ مشرقیہ
دائرہ معارف عسکریہ بغداد، عراق

(مترجم)

ظل ہما - حجرہ غموٹام وغیرہ

قیمت :- ۳ر
مع محصول ڈاک

وہ ہندو قوم جو شہیدان کربلا کی فدائی تھی

از جناب سید نظیر احمد مختار رضوی وکیل ولائف مجسٹریٹ و سابق آنریری اسسٹنٹ کلکٹر
درجہ اول - سیتا پور (یو، پی)

عرصہ ہوا دفتر شیعہ بیت المال جوہری محلہ لکھنؤ
سے ایک ہفتہ وار اخبار الناطق زیر نظارت جناب مولانا
مولوی سید کلب حسین صاحب قبلہ نکلا کرتا تھا۔ اُس کی
جلد چہارم کا نمبر ۱۸ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۲۳ء اِس وقت
میرے سامنے ہے جس میں ایک مضمون مندرجہ بالا
عنوان کے ساتھ مرسلہ آغا نذیر ہاشمی صاحب غازیپوری
درج ہے۔ یہ مضمون ایک اہم کڑی سلسلہ شہادت حضرت
سید الشہدا علیہ السلام کی ہے۔ ہاشمی صاحب نے نہایت
تحقیق سے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں برہمنوں کی ایک

کا شرف حاصل کیا۔

ہاشمی صاحب نے اپنے مضمون میں رتن جی کی
کتاب موہنیال و جنگنامہ مصنفہ احمد صاحب پنجابی و
رپورٹ بندوبست گجرات ۱۸۶۵ء کے حوالے
دیئے ہیں اور حسینی برہمنی نامی کتاب کا ذکر فرمایا ہے
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الشہداء علیہ السلام
کے حالات میں بہ زمانہ قدیم موہنیال برہمنوں کے وقت
میں ایک کتاب تیار کی گئی تھی۔

ہاشمی صاحب نے ختم مضمون پر ایک کبیر (شاعر)

محوری طاقتوں کو برطانیہ کا انتباہ

اگر ایتھنز پر حملہ کیا گیا تو روم کی خیر نہیں

لندن ۱۸ اپریل - بٹ ڈاوننگ اسٹریٹ

لندن سے حسب ذیل بیان شائع ہوا ہے:۔

جرمنوں کی ان دھمکیوں کے پیش نظر جو وہ ایتھنز
اور قاہرہ پر حملہ کی دے رہے ہیں ملک معظم کی حکومت
یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اگر ایتھنز اور قاہرہ
میں سے کسی جگہ حملہ کیا گیا تو روم پر بھی بمباری
طور پر شروع کر دی جائے گی۔ اور جب بمباری
ایک مرتبہ ابتدا ہو جائے گی تو پھر اُسے اختتام
جنگ تک برابر جاری رکھا جائے گا۔

اسقف اعظم کی بستی پر کوئی بمباری نہ کی
اور اس بارہ میں سخت احکام جاری کر دیئے گئے ہیں

از فاضل مشرقیات پروفیسر سید ظہر حسن صاحب جعفری

تمہید

اہمیت کے اعتبار سے عراق کو دُنیا کے اور ممالک پر تفوق حاصل ہے جس کے متعدد وجوہ ہیں
اول یہ کہ اس میں دو بہت بڑے دریا (دجلہ و فرات) ہیں جن کے درمیان کی زمین میسوپوٹیمیا یا
"ارض ما بین النہرین" کہلاتی ہے۔ یہ زمین زرخیزی کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہی ہے۔
ولایت موصل میں سال میں غلہ کی دو فصلیں ہوتی ہیں اسی وجہ سے اہل عراق اُسے اُم الربیعین
کہتے ہیں۔ موصل میں غلہ (جو اور گیہوں) اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے کہ سارے عراق کی سال بھر کی
ضروریات پورا کرنے کے بعد بھی کثیر مقدار میں بچ جاتا ہے۔ یہاں کی زمین کی قوت نامیہ کا اندازہ
اس سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ جو اور گیہوں کے پودے قد آدم کی بلندی تک پہونچ جاتے ہیں علاوہ
اس کے کپاس اور وہ بھی بہترین کپاس یہاں بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ گو مصر کپاس کے لئے مشہور
ہے لیکن ریشوں کی درازی اور رنگ کے اعتبار سے عراق کی کپاس مصری کپاس سے کہیں بہتر ہے
ولایت کے مشہور ماہرین فن زراعت اس بات پر متفق الرائے نظر آتے ہیں کہ اگر اس ملک میں سائنٹفک
اصول پر ترقی دادہ آلات کشاورزی کے ذریعہ سے زراعت کی جائے تو عراق بہ آسانی کل دُنیا کیلئے
غلہ کا مخزن اور روئی کا مرکز بن سکتا ہے۔ زراعتی نقطۂ خیال سے بھی عراق کی اہمیت محض اسکے غلہ
یا کپاس کی پیداوار پر منحصر نہیں ہے۔ دُنیا کے پردے پر کوئی اور ایسا مقام نہیں ہے جو عراق کے کھجور کے باغات کا
مقابلہ کرسکے۔ ہندوستان کے آم کی طرح عراق کی کھجور کے اقسام بھی بیشمار ہیں۔ یہاں کی کھجوریں دُنیا کی بہترین
کھجوروں میں شمار ہوتی ہیں۔ اور باوجود اسکے کہ کھجور یہاں سے لاکھوں من کی مقدار میں بیرونی ممالک کو جاتی
ہے تمام ملک سال بھر برابر کھجوروں سے پٹا پڑا رہتا ہے۔ مزید براں عراق متعدد قیمتی معدنیات کا بھی مخزن ہے
منجملہ انکے نفت یعنی مٹی کا تیل ہے جسکے چشمے خاصکر ولایت موصل کے ایک وسیع رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

عراق کو اس درجہ اہمیت دیے جانے کا دوسرا سبب اسلامی دُنیا کے ساتھ اُس کا گہرا تعلق ہے
عراق کی آبادی بیشتر عربوں پر مشتمل ہے جن کا قدیم وطن ملک عرب تھا۔ چنانچہ عرب کے عربوں
اور عراق کے عربوں میں عزیزانہ تعلقات ابتک اسی طرح قائم ہیں جس طرح اس زمانہ میں تھے جب
دونوں ہم وطن تھے۔ علاوہ بریں یہاں کی سرزمین مقدس مقامات متبرک مزارات اور واجب التعظیم

حضرت دانیالؑ، حضرت جرجیسؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ وغیرہم کے مزارات ہیں جن کا تقدس ہر مسلمان کی نگاہ میں یکساں ہے چاہے وہ عرب کا باشندہ ہو یا ترکستان کا، مصر کا ہو یا ایران کا۔ فلسطین کا ہو یا شام کا، روس کا ہو یا ہندوستان کا۔ لب ساحل فرات تو دو ایسے متبرک مقامات ہیں جو تقدس میں مکہ و مدینہ کے بعد دوسرا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں کربلا اور نجف ہیں جہاں وہ غمناک واقعات ہوئے ہیں جن کی یادگار قریب قریب دُنیا کے ہر ملک کے مسلمان کسی نہ کسی شکل میں مناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عراق میں ادنیٰ سی ہلچل سے دنیا کا ہر اسلامی ملک فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔

عراق کے وسیع وسائل آمدنی کو چھوڑ کر اور اُس اہمیت سے قطع نظر کر کے جو اسلامی دُنیا کے مرکز تمدن ہونے کی حیثیت سے اس کو حاصل ہے اس کی اہمیت کا ایک زبردست سبب اُس کا جغرافیائی محل وقوع بھی ہے۔ چنانچہ اسی کی بدولت بابل کو جنگی اور تجارتی اہمیت نصیب ہوئی اور اسی نے بغداد کو ایک وسیع سلطنت کا پایہ تخت بنا دیا۔ مزید براں خشکی کی راہوں کی ترقی اور ہوائی سفر کی ضرورتوں کے اعتبار سے عراق عین وسط میں واقع ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے اور سب سے زیادہ آمد و رفت رکھنے والے آیندہ راستوں کے مرکز اسی عراق میں ہونگے۔ اور اُن جملہ مسافروں کے لئے جو یورپ کے کسی حصہ سے ایشیا اور آسٹریلیشیا کے کسی حصہ کو سفر کرنا چاہیں لازم ہوگا کہ اسی شاہراہ سے گزریں۔ اغلب ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں بڑے بڑے ریل مرکز اور ہوائی جہاز کے اسٹیشن اسی عراق میں تعمیر ہوں گے اور تب اس کی اہمیت کا راز دُنیا پر اور بھی کھل جائے گا۔ برلن بغداد ریلوے کی تعمیر کوئی بچوں کا کھلونا نہ تھی۔ اس کا منشا محض یہ تھا کہ برطانوی سلطنت کو صدمہ پہونچایا جائے اور اگر برطانیہ نے عراق کی جنگی اہمیت کو عین وقت پر دریافت نہ کر لیا ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ اُسے سخت مصیبت کا سامنا ہوتا۔

عراق کے خصوصیات میں سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی خصوصیت یہ ہے کہ اسکی سرزمین اب سے ہزاروں سال پہلے کے مختلف تمدنوں کا گہوارہ ہونے کے علاوہ آثار قدیمہ کے خزانوں سے مالامال ہے۔ کہیں منہدم مزارات ہیں کہیں پر منارے اور محل کھڑے ہیں کہیں بڑے بڑے ٹیلے ہیں جنکے اندر قدیم زمانہ کے شہروں کے آثار مدفون ہیں کہیں پر خرابے ہیں جو بظاہر چھوٹے لیکن تاریخی حیثیت سے بڑی اہمیت والے ہیں کسی جگہ نہروں اور تالابوں کے نشانات ہیں کسی جگہ ٹوٹے پھوٹے بت اور دیگر اقسام کی صناعیوں کے نمونے ہیں جن کی بدولت یہاں کی سرزمین ساری تہذیب

دُنیا کے حق میں ایک خاص تعلیمی اہمیت رکھتی ہے۔ ملک مصر پر تو اب مغربیت چھا گئی ہے لیکن اگر کسی سیاح کو مشرقی شان کا نظارہ دیکھنا ہو تو چاہیے کہ عراق کے بازاروں میں پھرے۔ بابل کے بدوؤں سے ملے۔ اونچے اونچے پہاڑوں پر بسنے والے کردوں سے ملاقات کرے۔ یزیدیوں اور قدیم نصرانیوں کو دیکھے۔ صُبیتوں کے قریوں میں جائے۔ اور دجلہ کے ملاحوں۔ بصرہ کے تاجروں ایران اور سمرقند کے زائروں کو دیکھے۔ ایسی سرزمین پر جو تاریخی خزانوں سے معمور ہو سیاح کو مشرقی تمدن کے وہ رنگ اور زمانۂ ماضی و حال کی حالتوں کے وہ جلوے نظر آئینگے جو دُنیا کے کسی اور ملک میں دیکھنے نصیب نہوں۔

یہاں کی بیشمار قدیم یادگاریں یورپ اور امریکہ کے عجائب خانوں کو بھیجی جا چکی ہیں لیکن اب بھی اس کثرت سے موجود ہیں کہ کم از کم ایک اور صدی تک علماء آثار قدیمہ کی توجہ اُن کی طرف مبذول رہ سکتی ہے لیکن ساتھ ہی اسکے یہ بھی ضروری ہے کہ ان قدیم مقامات کی حفاظت پورے طور پر کی جائے۔ گو بغداد میں اب ایک مختصر سا عجائب خانہ عراق کی بعض برآمد شدہ قدیم اشیاء کی حفاظت کے لئے قائم کر دیا گیا ہے لیکن اگر اسکو اور وسعت دیدی جائے اور موجودہ اشیاء کے علاوہ ان یادگاروں کے مصنوعی نمونے تیار کرا کے اسمیں رکھدیے جائیں جو غیر ممالک کو بھیجی جا چکی ہیں۔ اور ساتھ ہی اسکے اہل سیریا کے فنون اور خاصکر فن تعمیرات کے خاص خاص نمونوں کو از سر نو پبلک کے سامنے پیش کیا جائے تو کیا عجب ہے کہ بابل و نینوی کے زائرین کی تعداد رومۃ القدیمہ (Ancient Rome) کے آثار قدیمہ دیکھنے والوں کی تعداد سے بھی بڑھ جائے۔

اس مضمون کے لکھنے سے پہلے میں ایک ناگہانی آفت کی بدولت مجروح ہو کر تقریباً دو ہفتہ تک صاحب فراش رہا ظاہر ہے کہ جو شخص دن رات کے عرصہ میں کم سے کم چودہ گھنٹے روزانہ درس و تدریس کے مشاغل میں مصروف رہتا ہو اس کے لئے مسلسل دو ہفتہ کی یکلخت بے شغلی کس درجہ تکلیف دہ ہو گی۔ لہذا اس بے شغلی کی مصیبت سے نجات پانے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ مجھے نظر نہ آیا کہ عراق ایسے انتہائی درجہ کی اہمیت رکھنے والے ملک کی جس کی سیاحی میں میری عمر کا بیشتر حصہ صرف ہوا ہے مختصر ترین قدیم تاریخ کے علاوہ اسکے آثار قدیمہ کے مختصر حالات قلمبند کروں جنمیں سے بیشتر کی زیارت کا شرف مجھے حاصل ہو چکا ہے جن کے دیکھنے میں میں نے سفر کے صعوبات کے علاوہ کافی روپیہ صرف کیا ہے۔ جن کے میں نے فوٹو لئے ہیں اور متعدد قدیم تاریخوں کے مطالعہ کے بعد ان کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ کیا عجب ہے اس مختصر سے مضمون کے مطالعہ کے بعد ناظرین میں سے

نمونے اور زمانہ کے عجائبات اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اس تاریخی مضمون کی تالیف میں کئی مستند انگریزی تاریخوں سے مدد لی گئی ہے۔

سید اطہر حسین جعفری

تاریخ
عراق قدیم

اب سے تقریباً چھ ہزار برس پہلے والے عراق اور موجودہ عراق کے حدود میں بہت فرق ہے۔ اُس زمانہ میں خلیج فارس جنوب کی طرف ایک بہت وسیع رقبہ پر محیط تھا جو اب خشک زمین کی شکل میں منتقل ہو گیا ہے اور اس خلیج کا ساحل موجودہ زمانہ کے ساحل سے ۲۰ میل اور شمال کی طرف پھیلا ہوا تھا وہ مقامات جہاں پر اب محمرہ۔ بصرہ۔ قرنا اور عمارہ آباد ہیں اُس زمانہ میں سب زیر آب تھے۔ اور ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ مقامات جو بعد میں شومیر اور عقاد کے نام سے مشہور ہوئے اُس زمانہ میں ایک مثلثی شکل کی زمین پر واقع تھے جس کا ایک نقطہ سامرہ۔ دوسرا عمارہ اور تیسرا ناصریہ کہا جا سکتا ہے۔

ذرائع معلومات

سقوطِ بابل سے (جو ۵۳۹ ق۔م میں واقع ہوا) پہلے کے جو تاریخی حالات اس مُلک کے ہم کو معلوم ہوئے ان کا دارومدار اُن کامیاب نتائج پر ہے جو متعدد منظم تحقیقاتی مہموں نے اُن ٹیلوں کو کھود کھود کر برامد کئے ہیں جہاں پر قدیم شہروں کے آثار قدیمہ مدفون تھے۔ اب سے تقریباً ۹۰ سال پہلے تک یعنی برطانوی اور فرانسیسی مہموں کی کھدائی کا کام شروع ہونے سے پیشتر تک تو اس مُلک کی قدیم تاریخ بالکل تاریکی میں تھی۔ اس کے انکشاف کا سہرا اول رالن سن۔ لے یارڈ۔ باٹا۔ جارج اسمتھ۔ ایسے حضرات کے اور اسکے بعد متعدد انگریزی۔ امریکائی۔ فرانسیسی اور جرمن تحقیقاتی مہموں کے سر ہے۔ ٹیلوں کی کھدائی کے سلسلہ میں جو چیزیں برامد ہوئیں مثلاً عمارتیں یا وہ پتھر جن پر جنگوں کے مناظر نقش تھے۔ بُت۔ زیورات۔ اسلحہ۔ ظروف حتیٰ کہ ہر وہ شے جس سے اب سے ہزاروں سال پہلے کے مردوں اور عورتوں کے روزانہ زندگی کے حالات معلوم ہو سکتے تھے۔ ان سب کو تحقیقاتی مقصد کا صرف نصف حصہ سمجھنا چاہئے باقیماندہ نصف حصہ کی کمی کو

سر ہنری رولنسن کے ذہن وقاد نے پورا کیا جنھوں نے گزشتہ صدی کے وسط میں اس مُلک کے قدیم باشندوں کے ایجاد کردہ میخی رسم الخط کے پڑھنے کا علم دریافت کیا۔ مذکورۂ بالا ذریعہ سے جو شہادتیں ہم کو بہم پہونچی ہیں اُن ہی بنا پر اس ملک کی قدیم تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔

عصر قدیم

اس مُلک کی تاریخ کے بارہ میں پہلی عجیب بات تو یہ ہے کہ ہم کو اُن قدیم ترین وحشیانہ زندگی بسر کرنے والے لوگوں کا حال بہت ہی کم معلوم ہے جو اس ملک میں آباد تھے۔ حالانکہ اور ملکوں میں تو اکثر ایسے علامات پائے جاتے ہیں جن سے عصر حجری (Neolithic Period) یعنی ایسے انتہائی قدیم زمانہ کا پتہ چلتا ہے جب لوگ نوک دار پتھروں سے ہتھیاروں۔ چھُریوں۔ کلہاڑیوں اور تیر کی گانسیوں کا کام لیا کرتے تھے۔ اور اس وقت تک اُن کو اس بات کا علم نہ تھا کہ بعض دھاتیں ایسی بھی ہیں جنھیں اگر آگ میں تپایا جائے تو وہ گل کر سخت اور ٹھوس چیز بن جائیں۔ اسکے صرف دو وجوہ ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ اس ملک پر کبھی ایسے لوگوں کا قبضہ ہی نہیں رہا جو دھات کے بجائے پتھر کے اوزار استعمال کرتے تھے (لیکن بابل میں اس قسم کے پتھر کے اوزار برامد ہونے کے بعد یہ وجہ قابل قبول نہیں رہ سکتی)۔ دوسرے یہ کہ ایسے ملک میں جہاں سیلابوں کی کثرت ہو اور جہاں کا قدیم باشندہ اپنا کام محض مٹی۔ لکڑی اور جانوروں کی کھالوں سے نکالتا ہو اور اس نے کوئی پتھر ہمارے لئے یادگار کے طور پر نہ چھوڑا ہو۔ قدیم آبادی کا کوئی نشان باقی ہی نہ رہ گیا۔ اس موخر الذکر توجیہ کے ضمن میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ بالائی فرات کے بعض ایسے مقامات پر جہاں چقماق کے ٹکڑے بکثرت موجود ہیں کچھ پتھر کے اوزار برامد ہوئے ہیں اور سوسا اور موسیان کے ٹیلوں کے علاوہ خود بابل کے کھنڈرات کی کھدائی کے وقت کچھ ایسی چیزیں گو قلیل مقدار میں سہی برامد ہوئی ہیں جو حجری عصر کے آثار قدیمہ میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

تاریخی دور کا آغاز

(۴۰۰۰ ــ ۳۰۰۰ سال قبل مسیح)

بابل کی تاریخ سے قبل زمانہ کے باشندوں کا مسئلہ ابھی تک عقدۂ لاینحل بنا ہوا ہے

عصر حجری کے وجود کے شواہد ابتک جو بھی ہم پہونچے ہوں اُن سے قطع نظر کرکے ہم اس مدت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جسے عراق کے ٹیلے دور تاریخی کا آغاز بتاتے ہیں اور جو ۴۰۰۰ سے ۳۰۰۰ قبل مسیح کا زمانہ ہو سکتا ہے اور جس کا علم اُس زمانہ میں ہم کو بھی ہوا ہے۔ عصر حجری کے بعد تمدن کی جانب تدریجی ترقی کا کوئی نشان نہیں ملتا ابتدائی تاریخی مدارج ترقی کی بدولت ہم کو دو قوموں کے آثار قدیمہ کا پتہ چلتا ہے جو اُس زمانہ میں بام ترقی پر تھیں اور پہلو بہ پہلو عراق میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک تو اہل سمیریا تھے جو جنوبی بابل کے باشندے تھے۔ دوسرے سامی نسل کے لوگ تھے جو شمالی بابل (عقاد) میں رہتے تھے۔

جنوبی بابل کے سومیری یا شومری

اغلب ہے کہ شومریوں کا قبضہ اس مُلک پر سامیوں سے پہلے سے رہا ہو۔ وہ ہجرت کرکے اس ملک میں ایسے زمانہ میں وارد ہوئے تھے جب اُن کا تمدن کمال کے درجہ تک پہونچ چکا تھا۔ اور جیسا کہ ہم کو اُن کے آثار سے پتہ چلتا ہے وہ پتھر پر نقش و نگار بہت اچھی طرح بنا سکتے تھے اور اینٹوں سے مکان تعمیر کرسکتے تھے۔ اور اُنکی سب سے بڑی یادگار وہ مسماری (میخی) خط ہے جس کے وہ موجد تھے اور جو اُس زمانہ میں ترقی کے زینہ پر پہونچ گیا تھا۔ دو شواہد ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً وہ عراق میں مشرق کی طرف سے ایرانی حاروذ کو عبور کرکے آئے۔ پہلا امر تو یہ ہے کہ اُن کی زبان میں جو شومری کہلاتی ہے ترکی اور وسطی ایشیا کی دوسری منگولی زبانوں سے مشابہت کے نشانات پائے جاتے ہیں دوسرا امر یہ کہ اُن کی اُن یادگاروں میں جو بابل کے ٹیلوں سے برآمد ہوئی ہیں اور اُن یادگاروں میں جو ترکستان میں ۱۹۰۳-۰۴ء کے پمپلی کے حفریات میں دستیاب ہوئی ہیں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔

شمالی بابل کی سامی شاخ

سامی کی لفظ سے جو مشتق ہے سام بن نوح کے نام سے مراد ہے ایسے خاندان سے جس سے پانچ قومیں نکلی ہیں یعنی اہل اسیریا (و سامی بابلی) عبرانی (و اہل فنیشیا) ارامی۔ اہل عرب اور اہل اتھیوپیا (یا حبشہ)۔ یہ قومیں ایسی اپنی اپنی خاص زبانیں بولتی ہیں جو ایک ہی اصل زبان سے نکلی ہیں جو شومری زبان سے بہت مختلف ہے اور پانچ گروہوں میں منقسم ہونے سے

پہلے ان سب کا واحد وطن غالباً عرب تھا۔ اس بحث کی کہ قدیم ترین زمانہ میں ان سب کا اصل وطن کیا تھا۔ اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ اور نہ ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ سامی لوگ عقاد میں فلاں راستہ سے داخل ہو کر آباد ہوئے تھے۔ ہاں یہ البتہ پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت پڑھے لکھے نہ تھے۔ انھوں نے علوم اپنے سے زیادہ اختراعی طبیعت رکھنے والے شومریوں سے اسی طرح حاصل کئے جس طرح اُن کے دوسرے بھائیوں یعنی فلسطینیوں نے بظاہر مصریوں سے حاصل کئے تھے اور حقیقت میں اختراعی مادہ کی کمی اب تک سامیوں میں موجود ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ان کی طبیعت کو موسیقی سے لگاؤ تھا۔ ادبیات اور صناعی کے وہ فطری طور پر دلدادہ تھے اور ایک بزرگ ہستی کا چاہے وہ انسانی ہو یا الٰہی ان کے دل میں احترام تھا۔ لیکن اُنکی تاریخ اس بات کے بتانے میں قاصر ہے کہ ان میں فطری طور پر ایجاد و اختراع کا مادہ بھی تھا۔

شومریوں اور سامیوں کی شکل وصورت کا فرق

ہم کو معلوم ہے کہ شومری اور سامی دونوں پہلو بہ پہلو حضرت مسیح سے چار ہزار سال قبل عراق میں سکونت پذیر تھے۔ اُن کے مجسموں سے جو اب برآمد ہوئے ہیں معلوم ہوگا کہ شومری سر اور داڑھی دونوں کے بال منڈواتے تھے۔ ابتدائی زمانہ میں وہ اونی قبائیں پہنتے تھے جنکے دامن کو کمروں سے لپیٹے رہتے تھے۔ لیکن جب مذہبی پیشواؤں کا زمانہ آیا تو وہ بجائے لمبی قبا کے بائیں کندھے سے ایک شال یا کوئی اونی چادر ڈال لیا کرتے تھے جس کا چنا ہوا سرا آگے لٹکتا رہتا تھا۔ برخلاف اسکے قدیم زمانہ کے سامی سر اور داڑھی دونوں کے بال رکھتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتبوں میں ان کو سامی کے بجائے "سیاہ سر" لکھا جانے لگا۔

پہلے بابلی خاندان کے مغربی سامیوں نے موچھوں کو منڈانا شروع کیا۔ جیسا کہ نرم سین (۲۶۰۰ سال قبل مسیح) کے مجسّے کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ مرد یا تو لنگ باندھتے تھے یا ایک کپڑا جسم سے لپیٹ کر اسکے دونوں سرے بائیں کاندھے پر ڈال لیا کرتے تھے

تاریخ کا آغاز

قدیم ترین تاریخی دور (۴۰۰۰ ــــ ۳۰۰۰ ق م) میں مختلف شہری علاقوں کے شومری فرمانروا اپنے کو تبیسی (یعنی شہری خدا کا قائم مقام) بادشاہ کہلاتے تھے۔

یہ شہری علاقے (جنکی حیثیت تاریخ سے قبل کے زمانہ میں ایسی ہی تھی جیسی اس زمانہ کے دلدلی مقام کے عربوں کے نرکٹ کی جھونپڑیوں والے دیہات کی ہے) طاقت پکڑتے گئے جن کی امداد کا اصل منبع وہ ٹیلہ تھا جسپر شہر آباد ہوتا تھا اور جو ہمیشہ عمارتوں کے گرنے اور انہیں کے آثار پر دوسری عمارتوں کے تعمیر ہونے کی وجہ سے ہمیشہ میدان کی سطح سے اونچا ہوتا رہتا تھا تاریخی دور کے آغاز میں پتہ چلتا ہے کہ شہر لاغاش بہت ترقی کر گیا تھا۔ اُس کا فرمانروا مسیلم نامی بادشاہ تھا جسکے ایک کتبہ کے ملاحظہ سے پتہ چلتا ہے کہ آغازش (تل لیح) اسی کے زیر فرمان تھا۔ اُس کتبہ کی عبارت جو ایک سنگی گُرز کے سر پر کندہ ہے حسب ذیل ہے :-

مَسیلم۔ شاہِ لاغاش نے اس (بانئ ہیکل ننگرسو گرز کو ننگرسو کے نام پر وقف کیا ہے۔ اُس زمانہ کے لاغاش کے تبلیسی لوغل۔ شغ۔ النغور کے عہد میں۔

درحقیقت قدیم کتبوں کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہری ریاستیں ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہا کرتی تھیں۔ مذکور ہے کہ خود مسیلم ایکمرتبہ لاغاش (تل لوح) اور آما (یوخہ) کے درمیان کسی سرحدی جھگڑے کے چکانے کے لئے بلایا گیا تھا۔ برخلاف اس کے مسیلم کے تھوڑے ہی زمانہ کے بعد۔ شاہ اورنینا کے عہد کی تاریخ میں کسی قابل ذکر جنگی واقعہ کا پتہ ہی نہیں چلتا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے یا تو کوئی ہیکل تعمیر کرایا۔ یا کسی ہیکل کی تعمیر کی تجدید کی۔ یا نہریں کھدوائیں جو اس ملک میں نام و نمود کی آسان ترین شاہراہیں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں۔ جنگ کرنا تعمیر کرانا نہریں کھدوانا بادشاہوں کے دستورالعمل میں داخل تھا۔ ہاں کبھی کبھی اپنے شاندار کارناموں کو مٹی یا پتھر کی تختیوں پر البتہ لکھوادیا کرتے تھے۔

اس کے پوتے اناطوم (۲۹۰۰ ق۔م) کی طبیعت اُس سے کہیں زیادہ جنگجویانہ تھی چنانچہ اس کا ایک پتھر پر کندہ کیا ہوا مشہور کتبہ ہم کو دستیاب ہوا ہے جو گِدھوں والے کتبہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور جسپر اس کے سپاہیوں کی صورتیں نقش ہیں جو شہر اُما (یوخہ) کی طرف سے اپنے مُردہ دشمن کی لاش کو روندتے ہوے ڈھالوں اور برچھوں سے مسلح چلے جارہے ہیں۔ اسی سنگی لوح کے ایک ٹکڑے سے بہادر مُردہ سپاہیوں کے مدفن کا نشان بھی ملتا ہے جو اُس جنگ میں شریک ہوے تھے۔ وہ برہنہ دفن ہوے تھے اور ایک بڑے سے ٹیلے کے اندر قطاروں میں اس طور سے لٹائے گئے ہیں کہ ایک کے سر کی طرف دوسرے کا پیر تھا اور سب سے آخر میں ایک بیل کی قربانی کی گئی تھی۔

حقیقت میں اس نے فتح الامیوں پر پائی تھی سلطنت الام کی سرحد پشت کوہ کی پہاڑیوں اور ان کے جنوب و مشرق کی جانب برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں سے ملی ہوئی کہی جا سکتی ہے۔ اس پرانے کتبہ سے جسمیں اس بہتر سرزمین کے دلیر پہاڑی باشندوں کی شکست کا ذکر ہے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ کی ابتدا انھیں لوگوں کی جانب سے ہوئی تھی لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ آخر ان پہاڑیوں نے لاغاش کے خلاف جنگ کی غرض سے دجلہ ایسے ذخار دریا کو عبور کیسے کیا۔ اب رہا یہ امر کہ وہ ایسا کر بھی سکتے تھے اسکا پتہ اس سبب سے قدیم بابلی خط سے چلتا ہے جو لاغاش (تلی لوح) کے ٹیلہ سے برامد ہوا تھا۔ یہ خط مٹی کی ایک تختی پر ننمار دیوی کے کسی پادری کے ہاتھ سے خدائے ننگروسی کے اعلیٰ پادری کے نام غالباً ۲۸۵۰ ق۔م میں مسماری خط میں لکھا گیا تھا یہ ننگروسی لاغاش کا خاص دیوتا تھا۔ چنانچہ اسمیں لکھا ہے کہ اس نے کس طرح سے الامیوں کی ایک جماعت کو شکست دی تھی جس نے لاغاش پر حملہ کیا تھا۔

سقوط لاغاش

جنگ کے ذکر کو چھوڑ کر اُن مُلکی اصلاحات کا تذکرہ جو اُروکاغنہ شاہ لاغاش کے عہد میں ۲۸۰۰ ق۔م میں مُلک میں کیئے گئے تھے غالباً طبیعت کے لیئے زیادہ فرحت کا باعث ہوگا۔ عُشر اور دیگر محاصل وصول کرنے والوں کے ہاتھوں مُلک کی زمین عرصہ سے برباد ہو رہی تھی حکام کی دست درازیاں حد سے متجاوز ہو گئی تھیں حتیٰ کہ یہ لوگ دیوتاؤں کی موقوفہ اراضی ہی نہیں بلکہ اُن کے مندروں کے بیلوں تک کو اپنے تصرف میں لے آتے تھے اُنکی دیکھا دیکھی مندروں کے پجاری بھی اچھے خاصے ڈاکو بن گئے تھے۔ ان کی اور انکے علاوہ اور مظالم کی اصلاح اروکاغنہ نے کر دی اُس نے طلاق کے قوانین کو پہلے سے بہتر بنا دیا۔ اور یتیموں اور بیواؤں کے حقوق کی بھی اصلاح کر دی۔

سامیوں کا عروج

غالباً مشاہیر سلاطین کے تذکرہ کے علاوہ کچھ لکھنا ناظرین کی ملالت طبع کا باعث ہوگا۔ قدیم یادگاروں سے بیشتر عمارتوں اور جنگوں کے تاریخی حالات معلوم ہوتے ہیں کچھ زمانہ کے بعد (۲۱۶۰۰-۲۱۶۰ ق۔م) فرمانروایان عقاد میں سے دو بادشاہ شرغنی شرتی اور اسکا بیٹا نرم سین شہرت میں دیگر بادشاہوں سے بڑھ گئے۔ مقدم الذکر نے اس ملک میں ایک سامی

سلطنت کی بنیاد ڈالی اور شہر عقاد کو دار السلطنت قرار دیا۔ سقوط لاغاش کے بعد ہی تمام شومری شہروں کے درمیان ایک اتحاد قائم ہو گیا اور سارپنی کا شہر ان سب میں ممتاز قرار پایا جو حسب معمول تھوڑے ہی عرصہ میں عقاد کے بادشاہ شرغنی شرّی کی بڑھتی ہوئی طاقت کے زیر اثر آ ہی گیا۔ اس بات کے یقین کرنے کے لئے کافی شہادت موجود ہے اس بادشاہ نے شام کے ملک پر بھی چڑھائی کی تھی۔ حتیٰ کہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس نے خلیج فارس کے کسی جزیرہ کے خلاف ایک بحری مہم بھی روانہ کی تھی اُس کے بیٹے نرم سین کی بہترین یادگار ایک سنگی تصویر کی شکل میں دستیاب ہوئی ہے جو اس سے قبل کی اسی قسم کی صناعی کے مقابلہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ کسی پہاڑی ملک میں ساتونی اور اپنے اور دشمنوں پر فتح پانے کا منظاہرہ کر رہا ہے۔

سنہ ۲۵۰۰ ق۔م میں نرم سین کے بعد عقاد کے انحطاط کے ساتھ ہی لاغاش اپنے پتیسی اُر بو اور قودیہ کے عہد حکومت میں پھر ایک مرتبہ شہرت کی بلندی پر نظر آتا ہے۔ قودیہ ایک بہت ہوشیار صناع تھا جس نے شام کے شمال و مغرب کی طرف امانوس پہاڑ سے صنوبر کے لٹھے دریائے فرات کے ذریعہ اپنے محل اور مندروں میں صرف کرنے کے لئے منگائے تھے۔ اس کے لاغاش میں نن گرسو دیوتا کے اسی ننّو نامی مندر کے تعمیر کے متعلق (جو مٹی کے دو ستونوں پر قائم ہے) ایک قصہ مشہور ہے اور وہ یہ کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ بہت سے دیوتا آئے ہیں انہیں سے ایک نے نیلم کی تختی پر ایک مندر کا نقشہ بنا ہوا بادشاہ کو پیش کیا جس سے مقصد یہ تھا کہ وہ اسی نمونہ کا ہیکل تعمیر کرے۔

ایک مرتبہ پھر لاغاش گمنامی کی حالت میں آ جاتا ہے۔ اسلئے کہ سنہ ۲۴۰۰ ق۔م میں اُور (مقیّر) کے عروج کے ساتھ ہی اس کا زوال شروع ہو گیا۔ اس شہر کے اس نئے خاندان والے بادشاہوں میں سے اُور انغور اور ڈنگی نے الآم کا ایک حصہ اپنے علاقہ میں شامل کر لیا تھا حسب معمول (غالباً الآم کی چڑھائی سے پہلے) اُور کا بھی زوال شروع ہوا اور اسکی جگہ تقریباً سنہ ۲۳۰۰ء ق۔م میں اسین نے لی جسکی شخصیت کا ابھی اچھی طرح پتہ نہیں چلا ہے۔

بابل کا عروج

اس کے بعد بابل سلطنت کا مرکز بنا۔ اور اس طور سے اسکے فنا ہونے کے زمانہ تک

اس کی شان مرکزیت میں فرق نہ آیا۔ سنہ ۲۱۰۰ ق م کے قریب بابل کا ایک بزرگ ترین بادشاہ ہموربی نامی تخت سلطنت پر متمکن ہوتا ہے۔ اور اپنے اس یادگار ضابطۂ قوانین کی بدولت (جو ایک پتھر پر کندہ کیا ہوا سوسا ڈے۔ مورگن کو دستیاب ہوا تھا) اور بادشاہوں سے مقابلہ میں ممتاز نظر آتا ہے گو اس میں شک نہیں کہ وہ ان قوانین کا خود موجد نہ تھا لیکن اس کا ناشر اور شائع کنندہ ہونا یقینی ہے۔ اس ضابطۂ قانون کی عبارت کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں تمدن بلندی کے کس درجہ تک پہونچا ہوا تھا۔ اس ضابطہ میں کاشتکاری۔ مویشی چرانے۔ آبپاشی۔ غلامی۔ وراثت۔ سماج کی حفاظت وغیرہ سب کا ذکر موجود ہے۔

اسی زمانہ میں بابل کی جانب سے ایک دستہ فوج کا محافظت کے خیال سے اسیریا کو بھی روانہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی وقت سے اس شمالی سلطنت کا آغاز ہوتا ہے جسے دنیا کے ملکی معاملات میں کافی اور نمایاں حصہ لینا تھا۔ ہموربی کے بہت سے خطوط دستیاب ہوئے ہیں جو میخی خط میں مٹی کی تختیوں پر لکھے ہوئے ہیں ان سے اس زمانہ میں ملکی حالات کی بین تصویر نظر آتی ہے۔

اس طرح سے بابل کے سلاطین کے اول خاندان کا آغاز ہوتا ہے جو خطی یا حطیطیوں کی لشکر کشی کے ساتھ ہی صفحۂ ہستی سے غائب ہو گیا۔

حطیطی

حطیطیوں کی فوج کشی کے بعد سے اس ملک کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے غالباً ان کا سلسلہ اس بزرگ حطیطی نسل تک پہونچتا ہے جو تقریباً سنہ ۱۵۰۰ ق م میں وسط ایشیائے کوچک میں برسر اقتدار تھی اور جس کا پایہ تخت بوغز کوئی تھا جسے اناطولیہ کا قدیم شہر بطیریا کہا جا سکتا ہے اس خاندان کے بادشاہ ہتوسیل ثانی نے اس بڑی جنگ کے بعد جو سنہ ۱۲۸۸ ق م میں بمقام قادش حطیطیوں اور مصریوں کے درمیان ہوئی تھی سنہ ۱۲۷۱ ق م میں شاہ مصر رعمسیس سے ایک شاندار صلح کر لی۔ رفتہ رفتہ حطیطی جنوبی ملک میں پھیل گئے حتی کہ دریائے فرات کے قریب قریب شہر کارکمش (زمانہ حال کا جرابلس) اور ... پہونچ گئے جو کارکمش سے ... میل نشیب کی جانب ہے۔ خلاصہ یہ کہ نویں صدی ق م ... اور اسیریوں کے درمیان دریائے فرات کے مغرب طرف والے ملک پر حکمرانی کرتی تھی۔ ...

سلسلہ میں باہم لڑائیاں ہوتی رہیں۔

غالباً یہ لوگ ہندی۔جرمن نسل سے رہے ہوں گے۔ نویں صدی تک وہ اپنی سنگی یادگاروں پر عبارت ہیروغلفی خط میں لکھتے تھے حالانکہ اس سے قبل تیرھویں اور چودھویں صدی میں وہ مٹی کی تختیوں پر عبارت میخی خط میں لکھا کرتے تھے۔ جسے تغیر یافتہ بابلی خط سمجھنا چاہیے۔

بابل کا دوسرا خاندان اور قسیطی

حطیطی بابل پر عرصہ دراز تک قابض نہ رہ سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بابل کے دوسرے خاندان نے ملک سے باہر کر دیا۔ جز والف ثانی ق۔م کے وسط میں قسیطیوں کے حملہ سے مغلوب کئے گئے۔ یہ قسیطی جنکے بارہ میں گمان ہے کہ آریوں کی نسل سے رہے ہونگے اور جن کا خاص دیوتا سوریاش غالباً وہی ہے جو ہندوستانیوں کا سوریہ (سورج) یا یونانیوں کا ہلیوس (سورج) ہے۔ بابل کی سرزمین پر پھیل گئے اور اس ملک میں اپنا نشان چھوڑ گئے۔ انھیں کے زمانہ میں گھوڑے کا استعمال عام ہوا (حالانکہ یہ ثابت ہے کہ پہلے ہی خاندان کے زمانہ میں اس سے کام لینا شروع ہو گیا تھا) اور چونکہ گھوڑے کا مسماری (Cuneiform –) نام "خر مشرق" ہے اس لئے کیا عجب ہے کہ قسیطی عراق میں ایران ہی کی طرف سے آئے ہوں۔

اسیریا

بابل پر قسیطیوں کا قبضہ ہو جانے ہی کے زمانہ میں شمالی اسیریا پر اقتدار حاصل کرنا شروع کرتا ہے۔ اسیریوں اور سامی بابلیوں میں تھوڑا ہی فرق ہے۔ یہ دونوں نسل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس درجہ مربوط ہیں کہ انھیں ایک ہی سمجھنا چاہئے بات کرتے وقت یہ لوگ بابلیوں کی طرح گاف بولنے کے بجائے قاف بولا کرتے تھے۔ یہ فرق تلفظ کا عرب کے مختلف قبائل میں اب بھی پایا جاتا ہے تحریروں میں یہ بھی میخی رسم الخط استعمال کرتے تھے جس کے بعض حروف بابلی رسم الخط کے حروف سے شکل میں مختلف ہیں ان دونوں کے درمیان ابتدا ہی سے دائمی عداوت کے آثار خواہ ظاہری ہوں یا باطنی پائے جاتے ہیں جس کا خاتمہ اسوقت ہوتا ہے جس وقت کہ اہل میڈیا و بابل نے نینوی کو فتح کیا۔ ۶۱۲ ق۔م

مسماری یا میخی رسم الخط

جیساکہ اس سے قبل ذکر کیا جاچکا ہے سُومری لوگ قدیم زمانہ میں اپنا ذاتی رسم الخط غالباً ایران کی طرف سے اپنے ہمراہ لیتے آئے تھے۔ اسکی ابتدا جیسے تمام زبانوں کی ابتدا ہوتی ہے تصویروں سے ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ تصویروں کے بجائے انکی علامتیں خطوط کی شکل میں استعمال کی جانے لگیں۔ اس بات کا آسانی سے تصور ہو سکتا ہے کہ یہ صناع طبیعت والے لوگ روزانہ زندگی کی تصویریں مثلاً مردوں۔ عورتوں۔ گایوں۔ بیلوں اور ہرنوں کی شکلیں کس طرح ہڈی یا پتھر پر بنالیا کرتے تھے۔ اگر کوئی صناع اپنی انسانی شکل وصورت کے ذریعہ سے اپنی شخصیت کا اظہار کرسکے تو اس کو ترقی کا بڑا درجہ سمجھنا چاہئے۔ اس سے بھی بڑھکر یہ ہوگا کہ وہ کہیں "جانے" کے مدعا کا اظہار محض ٹانگ کا نقشہ کھینچکر کرسکے۔ اس سے بھی زیادہ ترقی کا درجہ یہ ہوگا کہ اس کی بنائی ہوئی ٹانگ تصویر "ٹانگ" کے ملفظ کا کام دے اور ایسی تصویروں کو وہ الفاظ کے ہجا کرنے میں کام میں لائے۔ مثلاً یہ کہ اپنے نام (مثلاً) "رابن سن" (Robinson) کے بجائے وہ رابن چڑیا اور سورج کی تصویر بنادے۔

گو ہمارے پاس کوئی خاص ثبوت اس امر کا نہیں ہے کہ بابل پر قابض ہوجانے کے زمانہ میں بھی وہ قدیم ایام کی طرح اپنی تحریروں میں تصویروں سے کام لیا کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی اسیریوں کے عہد کی مٹی کی تختیاں جو نینوی کے خرابہ سے برآمد ہوئی ہیں جو بتاتی ہیں کہ وہ کسی زمانہ میں ایسی تصویریں استعمال کرتے تھے گویا اس طور سے انھوں نے ایک قسم کی لغات کی کتاب (قاموس) مرتب کردی تھی جسمیں قدیم زمانہ کے طور پر بجائے الفاظ کے تصویریں تھیں جس طرح کسی زمانہ میں اسکے بعد والے رسم الخط میں تصویروں کے بجائے اُنکی خاص علامتیں استعمال ہوتی تھیں۔ قدیم تصویر والے رسم الخط کو چھوڑ کر اُس سے زیادہ ایک رواں خط اختیار کرنے کی وجہ معلوم کرنا ہو تو غالباً اُس فوجکشی کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوسکے گی جو سُومریوں نے بابل پر کی تھی۔ اس ملک میں لکھنے لکھانے کا سستے سے سستا سامان اگر مل سکتا ہے تو وہ مٹی یا نرکٹ کی تیلیاں ہیں۔ کوئی شخص مٹی پر ایک ہی سلسلہ میں بہ آسانی کوئی تصویر نہیں بنا سکتا۔ اس لئے اُسے کافی جانفشانی کے ساتھ اُن تصویروں کے نقوش مٹی پر بھدی اور زاویہ دار شکلوں میں بنانے ہوں گے اور یہ ترقی کرتے کرتے مقبول عام ہوجائے گا۔ بہت قدیم

زمانہ کی سمیری تختیوں پر جو حروف نقش ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نشان نرکٹ کی تیلی سے بنائے گئے تھے لیکن بعد والے زمانہ میں جو حروف بنائے گئے وہ غالبًا ایک قلم کے ذریعہ سے بنے ہوں گے جو بیشک کسی دھات کا ہوگا اور جس کی نوک مربع شکل کی ہوگی۔

یہ مسماری رسم الخط تمام مشرق قریب میں پھیل گیا۔ سب سے پہلے (جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں) اس کا استعمال شومیریوں نے کیا۔ اُن سے سامیوں نے اس کو لیا۔ جو حروف کے بجائے (شومریوں والے) الفاظ کے اعداد استعمال کرتے تھے تاکہ وہ اپنے الفاظ کو تحریر میں منتقل کر سکیں۔ ان کے ذریعہ سے یہ مسماری طرز تحریر اناطولیہ کے خطیطیوں نے اختیار کیا اور ان کے بعد شمال کی جانب اہل وان نے۔

سنہ ۱۴۰۰ ق۔م میں جب کبھی فراعنۂ مصر اور شاہان بابل کے درمیان مراسلت ہوتی تھی تو اسی طرز تحریر کے ذریعہ سے۔ اسکے علاوہ الامیوں اور ایرانیوں نے بھی اسکو اپنی کتابت میں داخل کر لیا۔ اہل بابل و اہل اسیریا تو اسکو قدیم تاریخی عصر سے لیکر مسیح سے دو سو سال قبل تک برابر استعمال کرتے رہے۔

گزشتہ صدی کے وسط تک تو البتہ یہ رسم الخط بالکل تاریکی کی حالت میں رہا۔ اُنیسویں صدی مسیحی کی ابتدا میں مسٹر گروٹ فنڈ (Grotefend) اس کے پڑھنے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے لیکن اسکے ٹھیک ٹھیک پڑھ لینے کے اصول دریافت کرنے کا سہرا سر ہنری رولنس کے سر ہے جنھوں نے محض اپنی خداداد ذہانت سے اس معمے کو حل کر دیا انکے پاس کوئی ایسا ترجمہ نہ تھا جیسا کہ شمپولین کے پاس مصری ہیروغلفی کتبوں کے پڑھنے کے وقت موجود تھا۔ انھوں نے بعض کتبوں سے چند بادشاہوں کے نام دریافت کر لئے اور اسی کو بنیاد قرار دے کر انھوں نے مسماری تحریر پڑھنے کے اصول کی عمارت تعمیر کر لی۔

اس خط میں جو لٹریچر مٹی کی تختیوں پر تحریر ہے اسکی مقدار بہت زیادہ ہے جس کا منتشر حصہ وادی دجلہ سے برآمد ہوا ہے۔ اور اپنے وجود میں شاہ اسیریا اشور بنی پال کے ادبی مذاق کا رہین منت ہے۔ (سنہ ۶۶۸-۶۲۶ ق۔م) اسی بادشاہ نے نینوی میں ایک شاہی کتب خانہ قائم کیا تھا اور اپنے وکلاء اور محصلوں کو حکم دیدیا تھا کہ جنوبی ہیکلوں کے اندر سے جو سرمایہ بھی مٹی والی کتابوں کا دستیاب ہو وہ سب کا سب اسکے لئے لے آئیں۔ نہ اس خیال سے کہ وہ پھر واپس نہ کی جائیں بلکہ اس خیال سے کہ انکی نقلیں تیار کرائی جائیں۔ جس طرح کوئی شخص کسی خانقاہ میں بیٹھ کر آج بھی

اسیریائی قلمی نسخوں کی نقلیں حاصل کرسکتا ہے۔ اس کتاب خانہ کی تقریباً دس ہزار تختیاں یا
کے ٹکڑے اب بھی برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ یہ تختیاں مختلف مضامین کی ہیں مثلاً دینیات
صرف و نحو وغیرہ۔ سات بڑی تختیوں پر تو مسئلہ تکوین مسلسل طور پر درج ہے جس میں بابل
والوں کے نقطۂ خیال سے دنیا کے وجود میں آنے کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ
بیل اور اژدہے کی جنگ کا حال اور خلقت انسانی کا بھی ذکر موجود ہے۔ بارہ تختیاں ایسی
ہیں جن پر بابلی پہلوان گلگمش کا طویل قصہ درج ہے جو اپنے دوست انگیدو کی موت سے
خوف زدہ ہوکر دائمی حیات کے راز کی تلاش میں نکلتا ہے جو ایک دور دراز مقام کے
رہنے والے حکیم کے قبضہ میں ہے اس کے دریائی سفر کا ذکر سندباد جہازی کے سفروں کے
قصہ میں آچکا ہے حتی کہ ضمناً اسکندر اعظم کے سیاحت کے ناقابل اعتبار قصوں میں بھی
اس کا ذکر آیا ہے۔ آخر کار وہ تست نشتیم کے پاس پہونچتا ہے جو اس سے طوفان نوح کا قصہ
دوہراتا ہے کہ کس طرح سے دیوتاؤں نے اپنے غضب کے اظہار کے طور پر زمین میں طوفان کو
مسلط کردیا۔ اور اس کو ہدایت کی کہ ایک کشتی تیار کرے جس میں بیٹھکر وہ ساحل نجات تک پہونچ سکے
چنانچہ طوفان آتا ہے اور بابلی نوح کی کشتی طوفانی سمندر کے تھپیڑے کھاتی ہوئی تیرتی
ہے۔ اتنے میں کشتی میں سے ایک ابابیل۔ ایک کوے اور ایک فاختہ کو ہوا میں اڑایا جاتا
ہے آخرکار کشتی کوہ نذیر کے کنارے آکر لگتی ہے اور ناخدائے کشتی دیوتاؤں کے نام پر
قربانی کرتا ہے۔ جو اسے حیات ابدی کا راز بتادیتے ہیں اور جو بقول تست نشتیم سمندر کی
تہ میں کسی نرکٹ کے درخت کے اندر پنہاں ہے۔ گلگمش حسب ہدایت تست نشتیم بحرین کے
موتی نکالنے والے غوطہ زنوں کی طرح اپنی ٹانگ میں ایک پتھر باندھکر سمندر میں غوطہ لگاتا ہے
تاکہ اس درخت کو نکال لائے۔ درخت اسے مل جاتا ہے اور وہ خوشی خوشی واپس ہوتا ہے
لیکن راستہ ہی میں اس کی خوشی غم سے بدل جاتی ہے۔ وہ کسی تالاب میں غسل کی نیت سے
گھستا ہے۔ اتنے میں ایک سانپ برامد ہوتا ہے اور اس درخت کو اس بیچارے سے چھین کر
بھاگ جاتا ہے۔

اسکے بعد اشتر کا قصہ درج ہے جو عشق و محبت کی دیوی ہے اور سیریا میں اشترتے
یا اشتروتھ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دیوی آسمان سے زمین پر اپنے گم شدہ محبوب تموز کی
تلاش میں اترتی ہے۔ اور اپنی اس حرکت سے ہیدلس کی ملکہ ارشکیگل کے غضب کی آگ کو

ہے۔ یہ قصہ حقیقت میں وہی سال کے مرجانے اور پھر موسم بہار میں زندہ ہوجانے کا
ہے انھیں فسانوں میں سے نماز دعاے استغفار۔ سحر۔ اور جھاڑ پھونک والے
سانی اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

مختلف شگونوں اور پیشگوئیوں کے ذریعہ سے اجرام سماوی کی گردش کے ذریعہ سے جانوروں اور پرندوں کے حرکات وسکنات سے حتی کہ ہر اُس شے کے ذریعہ سے جسے دیوتاؤں نے انسان کی رہنمائی کے لئے پیدا کیا تھا قدیم زمانہ کے جادوگر آیندہ کے حالات بتادیا کرتے تھے۔ اور جب انھوں نے یہ معلوم کیا کہ اگر سورج اور چاند فلاں فلاں مقام پر آجائیں تو بتایا جاسکتا ہے کہ فلاں قمری مہینہ کتنے دنوں کا ہوگا تو اس علم نجوم نے عملی صورت اختیار کرلی۔ اُن میں اطبار کی ہدایت کے لئے مختلف امراض کے اور بہت سی ایسی دواؤں کے نام ہیں جو اب بھی مستعمل اور مشہور ہیں۔ مثلاً ملیٹھی جسے اُس زمانہ میں شوشو کہا جاتا تھا اور اب بھی عرب میں سوس کے نام سے مشہور ہے اور اُسی طرح کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ امراض چشم کے لئے ایک قسم کے خبثہ کا جوہر استعمال کیا جاتا ہے۔ مختلف مضامین کے متعلق مثلاً جنگ بغاوت۔ فوجی نقل و حرکت۔ دجلہ کا کلک (ہندوستان کا لکڑی کا بیڑا جس سے اسباب وغیرہ لیجانے کے لئے بڑی کشتی کا کام لیا جاتا ہے)۔ کاروبار۔ ٹھیکہ۔ بیع۔ نکاح وغیرہ ہزاروں خط اُن تختیوں میں موجود ہیں۔

سلطنتِ اسیریا کا آغاز

اس زمانہ کے بعد سے شمالی طاقت بتدریج اُبھرنے لگتی ہے۔ جیسا کہ ہم کو ایک مسماری تختی سے جو برٹش میوزیم میں موجود ہے معلوم ہوا ہے بابل کے قسیطیوں نے تقریباً ۱۴۰۰ ق۔م میں اسیریوں کے ساتھ ایک مصالحت کی جس کی رو سے جنوبی سلطنت کا اقتدار کسی درجہ باقی رکھا گیا تھا۔ لیکن اسکے بعد اگر کوئی سلطنت حقیقتاً برسراقتدار کہی جاسکتی ہے تو وہ اسیریا کی تھی نہ کہ بابل کی۔ مصر اور اسیریا آپس میں عزیزانہ تعلقات پیدا کرلیتے ہیں جیسا کہ اُس تختی سے پتہ چلتا ہے جو مصر میں بمقام تل العمارہ برامد ہوئی تھی۔ اسمیں تو یہاں تک لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں دونو مختلف قوموں کے شاہی خاندانوں میں سلسلۂ مزاوجت بھی قائم ہوگیا تھا۔
[illegible]

ہے۔ یہ قصہ حقیقت میں وہی سال کے مرجانے اور پھر موسم بہار میں زندہ ہوجانے کا
ہے انھیں فسانوں میں سے نماز دعاے استغفار۔ سحر۔ اور جھاڑ پھونک والے
سانی اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

مختلف شگونوں اور پیشگوئیوں کے ذریعہ سے اجرام سماوی کی گردش کے ذریعہ سے
جانوروں اور پرندوں کے حرکات وسکنات سے حتیٰ کہ ہر اُس شے کے ذریعہ سے جسے دیوتاؤں
نے انسان کی رہنمائی کے لئے پیدا کیا تھا قدیم زمانہ کے جادوگر آیندہ کے حالات بتادیا کرتے
تھے۔ اور جب انھوں نے یہ معلوم کیا کہ اگر سورج اور چاند فلاں فلاں مقام پر آجائیں تو بتایا
جاسکتا ہے کہ فلاں قمری مہینہ کتنے دنوں کا ہوگا تو اس علم نجوم نے عملی صورت اختیار کرلی۔ اُن میں
اطبار کی ہدایت کے لئے مختلف امراض کے اور بہت سی ایسی دواؤں کے نام ہیں جو اب بھی مستعمل
اور مشہور ہیں۔ مثلاً مُلیٹھی جسے اُس زمانہ میں شوشو کہا جاتا تھا اور اب بھی عرب میں سوس کے
نام سے مشہور ہے اور اُسی طرح کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ امراض چشم کے لئے ایک قسم کے
خبثہ کا جوہر استعمال کیا جاتا ہے۔ مختلف مضامین کے متعلق مثلاً جنگ بغاوت۔ فوجی نقل و
حرکت۔ دجلہ کا کلک (ہندوستان کا لکڑی کا بیڑا جس سے اسباب وغیرہ لیجانے کے لئے بڑی
کشتی کا کام لیا جاتا ہے)۔ کاروبار۔ ٹھیکہ۔ بیع۔ نکاح وغیرہ ہزاروں خط اُن تختیوں میں
موجود ہیں۔

سلطنتِ اسیریا کا آغاز

اس زمانہ کے بعد سے شمالی طاقت بتدریج اُبھرنے لگتی ہے۔ جیسا کہ ہم کو ایک مسماری
تختی سے جو برٹش میوزیم میں موجود ہے معلوم ہوا ہے بابل کے قسیطیوں نے تقریباً ۱۴۰۰
ق۔م میں اسیریوں کے ساتھ ایک مصالحت کی جس کی رو سے جنوبی سلطنت کا اقتدار کسی
درجہ باقی رکھا گیا تھا۔ لیکن اسکے بعد اگر کوئی سلطنت حقیقتاً برسراقتدار کہی جاسکتی ہے تو وہ
اسیریا کی تھی نہ کہ بابل کی۔ مصر اور اسیریا آپس میں عزیزانہ تعلقات پیدا کرلیتے ہیں جیسا
کہ اُس تختی سے پتہ چلتا ہے جو مصر میں بمقام تل العمارہ برآمد ہوئی تھی۔ اسمیں تو یہاں تک لکھا
ہے کہ کسی زمانہ میں دو نو مختلف قوموں کے شاہی خاندانوں میں سلسلۂ مناکحت بھی قائم ہوگیا تھا۔

اور جس نے شمالی ممالک میں متعدد فتوحات حاصل کئے تھے۔ قالہ یعنی موجودہ زمانہ کے نمرود کی جو نینوہ سے جانب جنوب دو منزل ہے پایہ تخت ثانی کے طور پر بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ اور ۱۲۷۵ ق۔م میں اہل اسیریا بابل کو فتح کر لیتے ہیں۔ بارھویں صدی کے خاتمہ پر خاندان کا بادشاہ بنوخد نصر اول کے زمانہ میں بابل پھر ایک مرتبہ اقتدار حاصل کرتا ہے۔ اور یہ وہ زمانہ (تقریباً ۱۱۰۰ ق۔م) ہے جب اسیریائی بادشاہ تگلت پلیسر نے اسیریائی تلواروں کی شہرت مشرق سے مغرب تک پھیلا رکھی ہے۔ کتبے اور اپنی تصویریں پتھر پر کندہ کرا کے دریائے دجلہ کے کنارے پر نصب کرا دیتا ہے۔ حتی کہ بحر متوسط تک پہونچ جاتا ہے۔ اُسے اپنے فتوحات پر اتنا ناز ہے کہ وہ اپنی (مقام) اروادکی تاخت کا ذکر بھی پتھر پر کندہ کرا دیتا ہے اسمیں یہ بھی ذکر ہے کہ اُسکے اور فرعون مصر کے درمیان تحائف کی مراسلت ہوئی تھی۔ اگرچہ اس کے اقتدار کے آگے بابل نے سر جھکا دیا لیکن اسیریا کی قسمت ایک مرتبہ پھر پلٹا کھاتی ہے اور وہ ایک سو سال سے زیادہ کے لئے گمنامی کے پردہ میں مستور ہو جاتا ہے۔

سلطنت اسیریا کا تنزل

تقریباً ۹۵۰ ق۔م میں پھر ایک مرتبہ اسیریا اُس تاریکی کے پردہ سے سر نکالتا ہے جو اسپر عرصہ سے پڑا ہوا تھا اور پھر بحر متوسط تک اپنے اثر کو پہونچا دیتا ہے جہاں بیروت کے قریب نہر الکلب کے پاس والی چٹانوں میں اسیریائی سلاطین اپنے سنگی مجسمے دفن کیا کرتے تھے۔ دو بڑے بادشاہ اشور نتسر پال اور شلمنصر ثانی (جنھوں نے ۸۸۴ ق۔م سے ۸۳۰ ق۔م تک فرمانروائی کی تھی) ایک بہت وسیع ملک پر حکمران تھے شلمنصر ہی تھا جسے شاہ اسرائیل جہیو ابن اومری نے خراج دیا تھا۔ اس موقع کا منظر اسکی ایک پتھر کی لاٹھ پر کندہ ہے جو اب برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

لیکن شلمنصر کی سلطنت کا تعلق اصل میں اُس جنگ عظیم سے ہے جو فرات کے پچھم طرف حطیطی اتحادیوں اور اسیریا کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حطیطی اناطولیہ سے نکل کر ایشیائے کوچک میں دریائے فرات تک پھیل گئے ہیں (جیسا کہ اسکے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے) ان کا مشرقی حفاظتی مقام کارشمش (جرابلس) تھا جو شہر پناہ کے طور پر دریائے فرات کے کنارے آباد کیا گیا تھا تاکہ مشرق کی طرف سے مختلف اقوام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکے رکھے۔

یہ خوش نصیب قصبہ سرخ رنگ کی قابل زراعت زمین پر واقع تھا جسمیں ہر سال دوہری فصلیں (ملیٹھی اور گیہوں) پیدا ہوتی ہیں اور جس کے اطراف کے قریوں میں متعدد چھوٹے چھوٹے چنار کے باغات تھے۔ یہ قصبہ عالیشان محلات سے مزین اور سنگ تراشی کے بہترین نمونوں سے آراستہ تھا۔ اغلب ہے کہ مشہور اسیریائی ڈاکو نے بھی جرمنوں کی طرح سے ملک میں داخل ہونے کے لئے اسی مقام کو تجویز کیا ہوگا۔ کبھی اسکو اس مقام پر شکست حاصل ہوئی اور کسی زمانہ میں تل احمر کو فتح کرنا اسنے بہتر سمجھا جو تل برسیپ کا قدیم حطیطی شہر ہے اور جسے اس نے اپنی سلطنت میں شامل کرکے اس کا نام قار شلمنصر رکھا۔ اس کے بعد پھر اُسے بن حداد کی سرکردگی میں حطیطوں کی ایک جماعت سے مقابلہ کی نوبت آئی جو محض اس حریص لٹیرے کے خوف سے متحد ہو گئے تھے۔ غالباً انھیں طاقت آزما جنگوں کا اثر تھا جس نے اسیریا کی قوت کو ۷۴۵ ق۔م سے آگے تیسری اور آخر مرتبہ اُسکے اُبھرنے کے زمانہ تک کے لئے جو تغلث پلیسر کی تخت نشینی کا زمانہ تھا ایک مرتبہ پھر گھٹا دیا۔

آخری اسیریائی سلطنت

جیسا کہ آگے مذکور ہو چکا ہے ہم اپنے معلومات کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ قسیطیوں کے عہد کے بعد سے بابل نے سیاسیات میں حصہ لیا تو مگر بہت ہی کم۔ لیکن اب وہ اپنی کاہلی کو دور کرنا شروع کرتا ہے اور بتدریج چھٹی صدی میں اپنی لبدوالی سلطنت کے آخری زمانے تک پہونچ ہی جاتا ہے۔ لیکن اب بھی اسکو بہت ہی دراز مسافت طے کرنی ہے۔ اسیریا ۷۴۵ ق۔م سے ۶۰۷ ق۔م تک حسب معمول اپنے سطوت و جبروت کو برقرار رکھتا ہے تغلث پلیسر اپنی اس فلسطین والی زبردست مہم سے پہلے جو سقوط دمشق کے زمانہ میں (یعنی ۷۳۲ ق۔م میں) سر ہوئی اول بابل پر فوجکشی کرتا ہے۔ اسکے بعد سرغون (۷۲۲-۷۰۵) سناخریب (۷۰۴-۶۸۱) اسارہاڈون (۶۸۱-۶۶۸) اشور بنی پال (۶۶۸-۶۳۳) ایسے بادشاہوں کا شاندار دور شروع ہوتا ہے۔ اور اسیریائی سلطنت فلسطین مصر۔ جزیرہ عرب حتیٰ کہ کوہستانوں کو عبور کرکے ایران تک پہونچ جاتی ہے۔ سرغون ہی ہے جو ۷۲۲ ق۔م میں سماریہ کی فتح کے بعد بنی اسرائیل کو قید کرکے اسیریا میں لے آتا ہے۔ عہد سرغون سے آگے بابل الام (فارس) کی امداد کا محتاج رہتا ہے۔ اور اسیریا اور جنوبی مغربی فارس کے درمیان جنگ کا سلسلہ

چھڑ جاتا ہے۔ سناچرب کی سرکردگی میں ایک فوج سوسا اور مدکتو میں جو ایرانی پہاڑیوں پر واقع ہیں داخل ہوئی اور ٦٨٩ ق۔م میں بابل کو غارت کر دیا۔ اس اسیریائی بادشاہ نے جو لڑائیاں دلدلی مقامات کے لوگوں سے لڑی تھیں اُن کا نقشہ ایک سنگ مرمر کی تختی پر کندہ کرایا تھا جو اس زمانہ میں بھی موجود ہے۔ اسکے سپاہی کشتیوں پر سے لڑتے تھے جس طرح برطانوی سپاہی دریائے فرنا پر ترکوں سے لڑے تھے۔ اُسکے بیٹے سرحدون اور پوتے اشور بنی بال (جسے اہل روم سرداناپالس کہا کرتے تھے) کو بھی ایسی ہی مصیبت کا سامنا جنوبی مغربی فارس کے ساتھ (جنگ میں) ہوا تھا۔ ٦٧٤ ق۔م میں خنبان خالداش ثانی نے سوسا (مقام) سے بابل پر حملہ کیا۔ اور سپتور (ابوحباہ) تک پہونچ گیا لیکن اسیریائی ایسے نازک مقام پر تھے کہ اُس کو پسپا نہ کر سکے لیکن خنبان خالداش کی وفات کے بعد ہی الام میں ایک قحط پڑا۔ اسکے بھائی ارتکو نے (جو اس کے بعد اس کا جانشین ہوا) غلہ کے عوض میں اُن بابلی خداؤں کو جو سپتوا سے لوٹ میں آئے تھے واپس دیدیا۔ ٦٦٥ ق۔م میں پھر ایک مرتبہ الامی عراق کے ایک پہلو پر ٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرداناپالس کے سپاہی اسوقت مصر میں مصروف جنگ تھے۔ لہذا ایرانیوں کو ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا اور انھوں نے ارتکو کی سرکردگی میں دریائے دجلہ کو عبور کر کے خوب لوٹ مار شروع کی اور فتح کا شادیانہ بجاتے ہوئے اپنے ملک کو واپس آئے۔ وہ انتقام جو الام سے لیا جاتا تھا اور عرصہ سے ٹلتا چلا آرہا تھا آخر کار ارتکو کے جانشین توماّن کے زمانہ میں لیا گیا۔

توماّن نے سوسا میں خود اپنے ہی بھتیجوں کے قتل کی کوشش کی محض اس خیال سے کہ مبادا ان کے دل میں حکمرانی کی ہوس پیدا ہو۔ یہ بیچارے مع دیگر پچاس ایرانی دربار کے شہزادوں اسیریائی شاہ کے یہاں آ کر پناہ گزین ہوئے۔ توماّں نے دجلہ کے کنارے کے ایک گمبولائی نامی عشیرہ کے لوگوں سے سازباز کر کے اسیریا کو یہ دھمکی دی کہ اگر اُس نے مفروروں کو واپس نہ دیا تو اُسے جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ لیکن اسیریا کے شاہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا لہذا جنگ چھڑ گئی۔ دونوں فوجیں دریائے قارون سے تھوڑے فاصلہ پر سوسا کے قریب ٹلزنامی ایک چھوٹے سے قریہ میں مقابلہ کے لئے جمع ہوئیں۔ اور جنگ کا خاتمہ الامی فوج کی شکست پر ہوا۔ یہ ایک شجاعانہ جنگ تھی جو اشور بنی بال کی نظروں میں اس وجہ اہم معلوم ہوئی کہ اُسنے

برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کھجور کے باغات میں اسیریائی سپاہی الامیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ اور مقتول سپاہیوں کی لاشوں سے دریائے قارون کو پاٹ رہے ہیں۔ اسمیں الامی جنرل ہونی کے تاریخی واقعات مثلاً مایوسی کی حالت میں اپنی کمان کو توڑنے اور قوتمان کے قتل کے مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ ایک منظر اس طور سے دکھایا گیا ہے کہ اشور بنی پال اپنے باغ میں کھجوروں کے درختوں اور انگور کی بیلوں کے درمیاں فرش پر تکیہ لگائے بیٹھا اپنی چہیتی ملکہ کے ساتھ خوش فعلیاں کر رہا ہے۔ گویئے اور پیش خدمت ارد گرد کھڑے ہیں اور قریب کے ایک درخت میں ایرانی بادشاہ کا سر لٹکا ہوا ہے۔

اس کے بعد سے دونوں ملکوں کے درمیاں پوشیدہ عداوت برابر بڑھنے لگی۔ پہلے تو ۶۴۲ھ ق۔م میں بابل کو خوب لوٹا اور اس واقعہ سے تین سال بعد سوسا کے خلاف اپنی انتہائی کوشش صرف کر دی۔ اس تیسرے معرکہ کا ظاہری سبب بقول اسیریائی مورخ یہ تھا کہ کچھ لوگ نانا دیوی کا بت تقریباً ۱۶۳۵ سال قبل الام لے آئے تھے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح ہموربی کی سنگی لاٹھ بھی جسپر ملکی قوانین کندہ تھے لائی گئی تھی۔

اب اشور بنی پال نے مذہبی جذبات سے متاثر ہو کر اسکی واپسی کے تقاضہ کے لئے ایک خاص آدمی سوسا بھیجا۔ ساتھ ہی اسکے بعد بعض کلدانی باغیوں کی حوالگی کا بھی دعویٰ کیا۔ جیسا کہ پہلے ہی سے خیال تھا دونوں درخواستیں مسترد کر دی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسیریائی میدان کو طے کر کے سوسا پہونچ گئے۔ راستہ میں چودہ شہروں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا حتیٰ کہ خود پایہ تخت کو غارت کر ڈالا اس کے بعد سلطنت الام کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

میدی قبیلہ

باوجود اس اقتدار کے جو اسیریائی سلطنت کو حاصل تھا اُسکے کارناموں کا ورق اب پلٹ جاتا ہے۔ جنوب و مشرق کی طرف طوفانی بادل منڈلا رہے تھے۔ اور قدیم دُنیا کا ستانے والا اب کیفر کردار کو پہونچ رہا تھا۔ بابل نے اپنا آخری اور قطعی انتقام ۶۰۶ھ ق۔م کے قریب لے ہی لیا جس کا بانی مبانی میدی سردار تھا۔

میدیائی سلطنت کا آغاز کوہ زغروس اور اسکے مشرق کی جانب والے ملک میں ہوا اور ہمدان (قدیم اکبتانا) اُسکا پایہ تخت قرار پایا۔ اس مُلک کی سرزمین نہایت درجہ خوبصورت ہے۔

یہاں کی گھاس سے ہری بھری پہاڑیوں اور وادیوں اور عراق کے چٹیل میدان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس قول کی تصدیق اُن حضرات کے ذریعہ سے ہوگی جنھیں خوش قسمتی سے خانقین سے کرمان شاہ جانے والی سڑک پر سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے اسی مقام پر اُس آریرن قبیلہ کی تربیت ہوئی جو میدی کے نام سے مشہور ہے اور جسکی قسمت میں تاریخ دنیا کے اوراق میں بڑے بڑے کارنامے ثبت کرنا لکھا تھا۔ میدی ہم کو پہلے پہل نویں صدی قبل مسیح میں اسیریوں کو خراج دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تغلت پلیسر ۴۴ ، ق م میں اپنا لشکر دماوند تک پہونچا دیتا ہے جو قدیم زمانہ میں بکنی کہا جاتا تھا۔ اسی صدی کے رُبع آخر میں سماری کتابوں کے اندر دَیُوکو کا نام منائی فرقہ کے سردار کی حیثیت سے نظر آتا ہے جو فرقہ میدی سے شمال کی جانب گشت کیا کرتا تھا۔ یہ وہی نام ہے جسے ہر دوطوس ڈیوسس کہکر میدیائی سلطنت کا بانی قرار دیتا ہے۔

دیوسس کا بیٹا فراورتش اپنے باپ کے بعد تخت پر بیٹھا۔ چند سال کے بعد اُس نے اسیریوں سے مقابلہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکو شکست ہوئی۔ اسکی فوج کا بیشتر حصہ تباہ ہوگیا اور وہ خود قتل کر ڈالا گیا۔ اسکے جانشین سیاکسریز نے اپنی قدرتی ذہانت سے دریافت کرلیا کہ اگر اسیریوں سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے تو محض فن جنگ سے واقف سپاہیوں کے ذریعہ سے چنانچہ اس نے مناسب وقت کے اندر اپنی فوج کو از سر نو ترتیب دے کر اپنے قدیم دشمن کو شکست دیدی۔ اور اسیریا پر حملہ کردیا۔ اگر سیدی (   ) یکایک شمال کی طرف سے نکلکر میدیوں کے ایک بازو کی طرف نہ پہونچ جاتے تو غالباً وہ نینوئی کو فتح ہی کرلیتا۔ نتیجۃً اس حملہ سے مجبور ہوکر اُسے پیچھے ہٹنا پڑا اور اُرمیا جھیل کے شمال میں اپنے دشمن کے ہاتھ سے شکست کھائی۔

لیکن عرصۂ دراز تک اس فتح کا پھل کھانا سیدیوں کی قسمت میں نہ تھا۔ اس موقع پر سیاکسریس ایک خاص چال چلا اور وہ یہ کہ کسی مناسب موقع سے اس نے سیدیوں کے بادشاہ اور اس کے سرداروں کی ضیافت کی اور جب یہ دیکھ لیا کہ شراب کا دور خوب چل رہا ہے اور سب مہمان نشہ میں سرشار ہیں تو اُس نے اُن سب کو قتل کر ڈالا۔ اس طور سے ایک قسم کی کامیابی حاصل کرلینے کے بعد اس کو خواہش ہوئی کہ اسیریا کے خلاف ایک اتحاد قائم کرے۔ نبوپولاسر بابل سے آکر اُس سے مل گیا اور متحدہ فوج نے نینوا پر دھاوا کردیا۔

نینوئی میں جو کسی زمانہ میں اسیریا کا پایہ تخت تھا دو بڑے بڑے مشہور ٹیلے ہیں۔ قیونجق۔

اور نبی یونس - ان کے ایک جانب تو دریائے دجلہ ہے اور اتر۔ دکھن اور پورب کی طرف ایک بہت ہی جسیم مٹی کی فصیل بنی ہے جو اتنی طویل ہے کہ گھوڑے پر سوار ہو کر بھی ایک گھنٹہ سے کم میں اس کے گرد نہیں گھوم سکتے۔ یہاں کی زمین موج دار اور مٹی ہلکے سُرخ رنگ کی ہے۔ یہاں ہر قسم کی سنگ مرمر کی کانیں بکثرت ہیں جہاں سے اسیریا کے سنگ تراش پتھر حاصل کیا کرتے تھے۔ نینوی کے محل وقوع سے کچھ ہی فاصلہ پر سر بفلک کشیدہ پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ یہاں جاڑوں میں برف باری شاذونادر ہی ہوتی ہے اور گرمیوں میں حرارت ۱۱۰ درجہ سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے۔ بیشک اس زمین کی زرخیزی ہی رہی ہوگی جس نے ایک طاقتور قوم کو ایک حد سے زیادہ گرم اور حد سے زیادہ سرد زمین پر آباد ہونے کیلئے آمادہ کر دیا۔ موسم بہار میں یہاں ہرے ہرے گیہوں اور جو کے درختوں کا لہراتا ہوا سمندر نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ کردستان کی پہاڑیاں اپنے جھنڈ کے جھنڈ کنیر کے پیڑوں۔ نیلے پھولوں والی بھٹکٹیا۔ اور میووں کے درختوں کی وجہ سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوں لیکن اس سرزمین کی غلہ والی دولت ہی تھی جس نے سامیوں کو یہاں آباد ہونے کی ترغیب دلائی لیکن جس کے پاس غلہ کے مخزن کی کنجی ہو اُسے قحط کے زمانہ میں جنگ کے لئے آمادہ رہنا چاہئے۔

چنانچہ نینوی کو یہی پیش آیا۔ لہلہاتے ہوئے غلہ کے کھیتوں نے ایک منچلے شخص کے حق میں چارہ کا کام دیا۔ چونکہ اب یہاں اشور بنی پال کا ایسا کوئی بادشاہ نہ تھا اس لئے اسنے دکھن جانب والے غنیم کے آگے سر اطاعت خم کر دیا جس نے شہر کو خوب لوٹا۔ مارا۔ پھونکا۔ جلایا۔ سناچرب اور اشور بنی پال کے محلات۔ شاہی کتبخانہ۔ اشتر اور نیبو کے ہیکل غرضکہ سب کو خوب لوٹا اور تباہ کر دیا۔ لیکن مہربان مادر زمین سنگتراشی کے نمونوں اور مٹی کی تختیوں کے کتبخانہ کو حملہ آور کے خوف سے مدتوں اپنے دامن میں چھپائے رہی حتٰی کہ یہ قیمتی خزانہ کسی زمانہ میں برطانوی آثار قدیمہ کے تلاش کرنے والے حضرات نے نکالا اور برٹش میوزیم میں لیجا کر حفاظت سے رکھ دیا۔

بابل کی آخری سلطنت

(۶۰۷ ق۔م سے ۵۳۸ ق۔م تک کے زمانہ میں جس زمانہ میں کہ سائرس نے بابل پر قبضہ حاصل کر لیا) بابل ایک مرتبہ نیم گمنامی کے پردہ سے باہر نکلتا ہے گو نبوخذ نصر ثانی ایک نہایت ہی منظم و مکمل لشکر کے ساتھ شاہ مصر نیقو ثانی کے خلاف چڑھائی کرتا ہے (۶۰۵-۵۶۲ ق م) لیکن یہاں کے

اکثر و بیشتر بادشاہ بجائے جو ہوتے [illegible] معلوم ہوتے ہیں۔

آخری بادشاہ نبونیدس (جو ۵۵۵ ق م میں تخت نشین ہوا) تو درحقیقت سلف کے محققین آثار قدیمہ کے اسکول کا ایک نمونہ تھا۔ وہ ہمیشہ گزشتہ زمانہ کے حالات دریافت کرنے کی طمع میں قدیم خرابوں کو کھُدایا کرتا تھا جنگجویانہ صفت اس میں قریب قریب مفقود تھی۔ اسی کی اور اسی کے بیٹے بلشزار کی بدولت بابل کی سلطنت ایرانیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ باوجود ان باتوں کے مسکاپیٹرو بنوخدنصر ثانی کا شمار اس ملک کے بزرگترین بادشاہوں میں کیا جاسکتا ہے۔ وہ اینٹ اور چونے کے امکانات کو اسی طرح سمجھتا تھا جس طرح اس سے پہلے کا کوئی شخص سمجھتا ہوگا۔ بابل کے قریب قریب جملہ آثار قدیمہ جن کا اب انکشاف ہوا ہے اپنے وجود میں اسی کے محتاج ہیں۔ نیشو کے خلاف اسکی فوجکشی ایسی ہی باقاعدہ تھی جیسی اور شاہان اسیریا کی فوجکشی رہی ہوگی۔ گو چھٹی صدی قبل مسیح کے ربع ثانی میں اسیریوں نے مصر پر حملہ کیا تھا لیکن وادی النیل کے اُس حصہ کو جس پر انھوں نے قبضہ کرلیا تھا کبھی پورے طور پر اپنے زیر حکومت نہ رکھ سکے تھے۔ سقوط نینوی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس زمانہ کے فرعون مصر یعنی نیشو ثانی نے اتنا اقتدار حاصل کرلیا تھا کہ فلسطین پر حملہ کرسکے جس طرح رسیس ثانی نے تیرھویں صدی کے آغاز میں کیا تھا۔ مصری لشکر نے قدم بڑھائے اور کوہ کارمل کے قریب بمقام مجدو جوداہ کے بادشاہ جوسیہ کو شکست دی۔ پھر اور آگے بڑھا حتیٰ کہ کارشمس (اس زمانہ کا جرابلس) تک پہونچ گیا اور مفتوحہ ملک کے بیشتر حصہ پر دو سال تک قابض رہا۔ اسکے بعد شاہ بابل بھی شاہ مصر کے ساتھ اپنی قسمت کا فیصلہ کرانے کیلئے بڑھا۔ دونوں فوجوں کا بمقام کارشمس مقابلہ ہوا لیکن انجام کار نیشو کی فوج کو شکست حاصل ہوئی اور وہ جس راستے سے آئی تھی اسی سے واپس ہوگئی۔

سقوط بابل

ان ایسے ملکوں میں جہاں اِدھر ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا کہ اُدھر دوسرے نے تخت چھین لیا کسی قوم کا عروج اور اس کا زوال دونوں ایک ہی صدی کے اندر عمل میں آجاتے ہیں۔ اب بابل کے لئے ایک تازہ خطرہ درپیش تھا اور وہ ایران کی سلطنت تھی جو تیزی کے ساتھ ترقی کی چوٹی کی جانب قدم رکھ رہی تھی۔

شاہ فارس سائرس نے جسکے فتوحات ایران کو اُبھار کر اقوام عالم کی اولین صف میں لارہے تھے اب اپنی نظر توجہ اس میدانی زرخیز ملک کی طرف پھیری جو ایران کے پچھم جانب واقع ہے اور

غالباً بابلیوں کے تاجرانہ خصوصیات کا صحیح اندازہ کرکے اُنکے شہر پر ۵۳۸ ق۔م میں قبضہ کرلیا۔ بابل کی خاص فوج اوپیس کے مقام پر (جس کے بارہ میں گمان کیا جاتا ہے کہ قطیسفان کے قریب ہی کہیں رہا ہوگا) مقیم تھی۔ مشہور ہے کہ سائرس نے دریاے دجلہ و دیالہ دونوں کو جبکہ ان کا پانی بالکل گھٹ گیا تھا خشک کرادیا۔ اور اوپیس کے قریب اپنے دشمن پر حملہ کرکے انکو شکست دیدی۔ اسکے قائد عام گوبریاس نے جنوب کی طرف سپارتک بڑھکر بنونید وکو وہاں سے بھگادیا اور بلا مقابلہ کے بابل میں داخل ہوگیا۔ جس طرح برطانیہ نے بغداد پر قبضہ کرلینے کے بعد حکم جاری کردیا تھا کہ کسی سپاہی کو کسی مسجد کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے اسی طرح سائرس نے بھی حکم دیدیا تھا کہ جملہ ہیاکل مصئون و مامون رہیں۔ چنانچہ جب وہ شہر میں داخل ہوا تو رعایا نے اسکو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر مرحبا کہا۔

اب بابل کا اقتدار مٹ گیا تھا۔ گو اسکی سرزمین کی حیثیت اب ایک غلہ کے مخزن کی سی تھی جسکے قبضہ کے بارہ میں مختلف سلاطین کے درمیان جھگڑے لگے رہتے تھے اور اسکے شہر گویا شاہ اعظم کے حق میں خزانہ تھے جہاں سے ایرانی جنگوں کے لئے امداد حاصل کی جاتی تھی۔ لیکن بابل کو اس کا قدیم اقتدار پھر کبھی حاصل نہو سکا! ور ۳۳۱ق۔م تک اسپر ایرانیوں ہی کا تسلط قائم رہا۔ اس میں شک نہیں کہ جب داریوس اعظم ۵۲۱ق۔م میں تخت نشین ہوا تو سب سے پہلے جس ممالک نے بغاوت کی وہ بابل ہی تھا۔ ان باغیوں کا سردار ندنتو بیل تھا جو بنونیدس کے بیٹے ہونے کا مدعی تھا۔ لیکن داریوس نے اُسے بابل ہی میں محصور کرلیا اور دو سال کے اندر بابل پر پھر قابض گیا۔ اس نے اپنی سلطنت کا حال ایک پتھر پر کندہ کرایا تھا جس کا شمار دُنیا کے بہترین سنگی کتبوں میں کیا جاتا ہے کوہ بے ستون پر جو کرمان شاہ اور ہمدان کے درمیان واقع ہے اس ایرانی بادشاہ نے اپنے کتبے کو تین زبانوں میں پتھر پر کندہ کرایا تھا جسمیں اُن سرداروں کی تصویریں نمایاں طور پر بنائی گئی ہیں جنھوں نے اس کے خلاف بغاوتیں کی تھیں۔ اس کتبے کے نصب کرنے کے لئے جگہ کا انتخاب نہایت ہوشیاری کے ساتھ کیا گیا تھا اسلئے کہ پہاڑ کا وہ حصہ جہاں پر یہ کتبہ نصب ہے میدان کے مقابلہ میں بالکل سیدھا کھڑا ہے اور اسکے سبزہ سے لدے ہوے دامن سے نکلکر ایک سست رفتار چشمہ بہتا رہتا ہے۔ اس طرح سے ایک معمولی سی بغاوت کے بعد جو ۴۸۳ء میں بآسانی تمام دبادی گئی بابل کے عالمگیر اقتدار کا خاتمہ ہوجاتا ہے نتیجہ کے طور پر آیندہ بہت سال تک کوئی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا جو قابل ذکر ہو۔ اسمیں شک نہیں کہ اہل بابل نے ان تباہ کن جھوں میں

چہ دارا یوش اور زرکسیز کے زمانہ میں یونان کے خلاف بھیجی گئی تھیں حصہ لیا تھا لیکن اب اقوام عالم کے درمیان اس ملک کی قائدانہ حیثیت باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس زمانہ میں سیاہی دنیا میں بابل کا وہی درجہ تھا جو ترکوں کے عہد میں بغداد کا تھا۔

لیکن یونانی جنگجو نویسندہ زنوفون کی بدولت یہ ملک ایک مرتبہ پھر مرکز جنگ ہونے کی حیثیت سے مشہور ہو جاتا ہے۔ سائرس اصغر یعنی داریوس کا منجھلا بیٹا اپنے بھائی ارتازرکسیز فانی کے قتل کے ارادہ میں ناکام ہو کر جو اس زمانہ میں تخت ایران پر متمکن تھا ایشیاء کوچک کو واپس آیا جہاں کا وہ سابق میں حاکم تھا۔ چونکہ وہ انتہائی درجہ اولوالعزم تھا اس لئے اس نے اپنے بھائی سے تخت چھین لینے کے لئے اعلیٰ پیمانہ پر تیاری کی۔ سنہ ۴۰۱ ق۔م میں ۱۳۰۰۰ ہزار یونانیوں اور ایک لاکھ ایشیائی سپاہیوں کے کثیر لشکر کے ہمراہ بابل کے لئے روانہ ہوا۔ گو اس واقعہ کو دو ہزار سال سے زیادہ ہو گئے لیکن وہ راستہ جس سے یہ لشکر آیا تھا اس وقت تک تقریباً وہی ہے جو اس زمانہ میں تھا۔

مورخ اعظم زنیوفون اس عظیم الشان لشکر کی روانگی کا حال اس طرح بیان کرتا ہے۔ یہ لشکر سائیلیشیا کے خوبصورت دروازوں سے نکل کر تھپسکس آیا جو رقہ سے جو دریائے فرات کے کنارے آباد تھا بہت قریب تھا۔ لشکریوں نے یہاں پر دریا کو عبور کیا اور کنکسا کی طرف بڑھے جس کا محل وقوع اب تک غیر متحقق ہے اپنی غلط فہمی کی بدولت سائرس نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ ارتازرکسیز اپنے پہاڑی حصاروں کو واپس گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کو کونکسا کے مقام پر پہنچ کر ایرانی بادشاہ کی قربت کا علم ہو گیا جو اس کے حملہ کرنے سے پہلے ہی کئی لاکھ کے لشکر کے ساتھ اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ بہر حال سائرس کو کافی وقت ملگیا تھا اور اپنی جنگی تدابیر کے معجزہ کی بدولت ایرانی لشکر کے بائیں بازو کو شکست دیدی اسطور سے کہ ان مشہور ایرانی رتھوں کے پردوں کے مقابلہ میں جنکے اگلے حصہ میں تلواروں کے پھل جڑے ہوئے تھے اس نے یونانی سپاہیوں کی تعداد کو دوچند کر دیا جنھوں نے ان رتھوں کو مار بھگایا۔ ۶۰۰۰ کے مقابلہ میں ۶۰۰ سپاہیوں سے حملہ کر کے اس نے دشمن کے مرکز کو توڑ دیا۔ قائد لشکر کو قتل کر ڈالا اور خود ارتازرکسیز کو اسکے گھوڑے کی پشت سے گھسیٹ لیا۔

لیکن بدقسمتی سے ایک برچھی سائرس کی آنکھ پر آ کر لگی جس نے اسے ہلاک کر دیا اور وہ اسی میدان میں جسکو اسنے قریب قریب فتح کر لیا تھا راہی ملک عدم ہو گیا۔ اسکے لشکر کے

مشرقی سپاہی تو ہمت ہار گئے اور اپنے فرائض سے چشم پوشی کرکے بھاگ کھڑے ہوئے - اگر یہ سپاہی ایسا نہ کرتے تو یونانیوں نے میدان جیت لیا ہوتا - دوسرے دن تیسا فرنیس نے یونانیوں کو اطاعت قبول کرنے کی غرض سے طلب کیا لیکن وہ بگڑ کھڑے ہوئے اور ایسا کرنے سے انکار کر دیا - دو دن تک کافی گفت و شنید کے بعد تسافرنیس نے یہ محسوس کرکے کہ جو فوج میدان جنگ میں اپنی جانبازی اور دلیری کا کافی ثبوت دے چکی ہو وہ یقیناً خطرناک ہوگی اُسے اجازت دیدی کہ وہ بلامزاحمت اپنے وطن کو واپس جائے - اس طرح سے دس ہزار سپاہیوں کا لشکر نہایت شان کے ساتھ اوپس کے پاس سے گزرتا ہوا تریبزونڈ تک مراجعت کرتا ہے - زینوفون تریبزونڈ کا نام مسپلا بتاتا ہے - بیشک یہ وہی لفظ ہے جس سے موجودہ زمانہ کا لفظ موصل مشتق ہوا ہے - غالباً اصل میں یہ اسیریائی زبان کا لفظ موشپلو رہا ہوگا جسکے معنی نشیبی زمین کے ہیں اور کیا عجب ہے کہ اسی سے انگریزی لفظ مُسلین (تنزیب) نکلا ہو

اہلِ مقدونیہ کی آمد

اس زمانہ سے لیکر اسکندر کے عہد تک عراق کی حیثیت ایک گزرگاہ سے زیادہ نہ تھی جس سے ہوکر ایرانی سپاہی بحر متوسط کے ساحل تک جایا کرتے تھے - ۳۸۷ ق - م - میں اسپارٹا کے سفیر انتل سیداس کے سوسا آنے کے بعد اس صلحنامہ کی تکمیل ہوئی جو اسی کے نام سے مشہور ہے - اس صلحنامہ کی رو سے ایرانی بادشاہ نے یہ طے کرا لیا کہ ایشیائے کوچک سائپرس اور کلازومین ایرانی سلطنت میں شامل رہیں گے لیکن ہلاس کا علاقہ خود مختار رہے گا ۳۷۴ء میں ارتازرکسیز ثانی نے فرنابزوس کی سرکردگی میں مصر پر لشکر کشی کی - اور مصری شہر پلیوسیم (جو پورٹ سعید سے جنوب و مشرق کی طرف ۵۰ میل کے فاصلہ پر ہے) پر قبضہ کر لیا لیکن دریائے نیل کی طغیانی سے عاجز آکر لشکر کو اپنے حدود کے اندر واپس آنا پڑا - اسکے بعد جب ارشوس ارتازرکسیز ثالث کے نام سے تخت پر بیٹھا تو اس نے ۳۵۸ ق - م میں پھر مصر پر حملہ کیا - لیکن آخر میں اسکو شکست نصیب ہوئی جس کے بعد ہی ایران کے جملہ مغربی صوبوں میں بغاوتیں شروع ہوگئیں - بہر حال ۳۴۲ء میں اوشوس پھر مصر کے ارادہ سے روانہ ہوا اور راستہ میں فلسطینی ساحل پر سہاڈن کو فتح کرتا ہوا گیا اور اس مرتبہ وہ کامیاب بھی ہوا - لیکن ۳۳۶ء میں ایرانی دربار کے ایک خواجہ سرا بگواس نامی کے ہاتھ سے قتل ہوا جس نے ایرانی تخت پر بیٹھنے کے لئے ایک

کر دومنوس نامی کو منتخب کیا اور اُسے دارا یوس ثالث کا لقب دے کر بادشاہ بنا دیا۔

لیکن اب ایران کو ایک نئے دشمن اسکندر یونانی سے مقابلہ کرنا تھا جسکی سلطنت یونان کے شمال میں واقع تھی۔ اسکندر اعظم فیلقوس کا بیٹا ۳۳۶ ق۔م میں اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اسکے دوسرے ہی سال تھیبس واقع یونان کو فتح کر کے اس نے اپنی قیادت کی قوت کا ثبوت دیا۔ اُس کی ایشیا کے خلاف زبردست مہم ۳۳۴ کے بعد روانہ ہوئی جسکے لئے اس نے تیس ہزار پیدل اور ۵ ہزار سوار فراہم کر کے مس لوٹر اور ابی ڈورتہ کے درمیان ہلسپانٹ (درہ دانیال) کو عبور کیا۔ ایرانیوں نے دریائے گرانیکس پر اُسکا مقابلہ کیا۔ جو درۂ دانیال سے پورب طرف کچھ فاصلہ پر بحر مارمورہ میں گرتا ہے۔ لیکن ان کو شکست فاش ہوئی اور سمرنا سے ۵ میل جانب شرق لیڈیا کے پایۂ تخت سارڈیس کے راستہ کو یونانیوں کے لئے بالکل خالی کر دیا۔ چنانچہ لیڈیا نے بلا مقابلہ کے اطاعت اختیار کر لی۔ یونانی نوآبادیات نے بھی اسکندر کے آگے سر اطاعت خم کر دیا جس سے تارسس سے ۳۰ میل جانب شمال ایشیائے کوچک کی بڑی گھاٹی ہوسوم بہ بابِ سائی لیشیا تک پہونچ جانے کا اسے موقع مل گیا۔ جب وہ اس گھاٹی پر پہونچا تو اسے مسدود پایا لیکن چونکہ ایرانیوں پر سکندر کا رعب طاری ہو چکا تھا اس لئے گھاٹی کے محافظین نے اُسے بلا مقابلہ خالی کر دیا۔ سکندر دریائے جیحون کو عبور کرتا ہوا الاسکندریہ سے مشرق جانب بیلن کی درہ کوہ تک پہونچ گیا۔

دریائے جیحون خلیج الاسکندریہ کے مغربی حصہ میں داخل ہوتا ہے جس کا ساحل بہت ہی خوشنما ہے اس نیلگوں خلیج کے اتر جانب زمین بتدریج اونچی ہوتی جاتی ہے اور آخر میں ناہموار پہاڑی میدان کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس سے شمال کی جانب جبل النوس کی پتلی دیوار دور تک چلی گئی ہے۔ موسم گرما کے ابتدا میں یہ پہاڑیاں رنگ برنگ کے پھولوں سے لدی ہوئی بالکل دُلھن بنی رہتی ہیں اور جبل کے نشیبی کناروں پر کانٹے دار گھنی جھاڑیوں کی ایک بھول بھلیاں سی بن جاتی ہے۔ خلیج الاسکندریہ کے سے چھوٹے بندرگاہ کو ہمیشہ غضب کی نگاہ سے تاکا کرتی ہے پورب طرف باہر کی جانب نکلا ہوا وہ کوہستانی سلسلہ ہے جس سے ہو کر درۂ بیلن کے قریب حلب کو سڑک جاتی ہے۔

اس درہ پر اسکندر نے یہ سمجھ کر قبضہ کر لیا تھا کہ داریوس حلب کے آس پاس ہوگا لیکن اس کی اطلاع غلط ثابت ہوئی اسلئے کہ اس وقت دارا بقول مورخ ۵ لاکھ سپاہیوں کے لشکر کے ہمراہ اسی کے پیچھے پیچھے شمال کی جانب ایک دوسرے درہ سے ہو کر گزر رہا تھا۔

غرضکہ اطلاع پاتے ہی یونانی فوج نے رُخ پھیر لیا۔ اور اُس ڈھال سے اُتر کر جدھر سے وہ دمہ دبالین پر پڑھی خلیج کے قریب تک آئی اور پیچھے مُڑ کر دشمن کے نشان قدم چلاجتی کہ پہاڑ اور سمندر کے درمیان مقام اسّس کے قریب جو الاسکندریہ سے شمال تھوڑے ہی فاصلہ پر واقع ہے ایرانی فوج پر حملہ کر دیا۔ اس بات کے ثبوت میں کہ ایک مختصر سی مگر جنگی تعلیم پائی ہوئی فوج ایک غیر تعلیم یافتہ سپاہیوں کے کثیر لشکر کے مقابلہ میں کیا کچھ کر سکتی ہے یہ جنگ ایک نمونہ کی جنگ کہی جاسکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مقدونیہ والوں کو کامل فتح نصیب ہوئی۔ ایرانی بری طرح شکست کھا کے بھاگے لیکن ہزاروں کی تعداد میں راستہ ہی میں قتل کر ڈالے گئے۔ اب سکندر اعظم کو بحر متوسط کے زرخیز ساحل تک پہونچنے کے لئے راستہ بالکل صاف ہو گیا تھا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے لئے ایرانیوں کو چھوڑ کر تاہر پر جا دھمکا۔ ٹایر نے اور اسکے بعد ہی مصر نے اطاعت قبول کر لی (۳۳۲ - ۳۳۱) ق - م۔ اسکے بعد اسکی فوج تھپا سکس کی جانب بڑھی جو اس زمانہ میں بھی دریائے فرات کا معبر ہے۔ یہاں پر سکندر نے کشتیوں کے دو پل تیار کرائے تھے۔ یہاں سے وہ جانب شمال حرّان کی طرف بڑھا جو خدائے قمر کا مقدس شہر تھا اور پھر یہاں سے دجلہ کی طرف قدم بڑھایا۔ دارپوس نے اربیلہ کی جانب نینوئی کے خرابہ سے پورب کی کسی مقام پر اپنے لشکر کو پھر سے ٹھیک ٹھاک کیا تھا اور آخری جان توڑ مقابلہ کے لئے سکندر کا انتظار کر رہا تھا۔

آخری جنگ گوگا میلہ (زمانۂ حال کا کرم لیس) کے مقام پر ہوئی۔ یہ مقام نینوئی سے پورب طرف ۱۵ میل کے فاصلہ پر ہے جو بہار کے موسم میں جو کے ہرے بھرے۔ شاداب اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گھرا رہتا ہے۔ دارپوس نے اس موقع پر اپنی کثیر التعداد فوج اور رتھوں کے نقل و حرکت کے خیال سے بمقابلہ الاسکندریہ تنگ ساحلی دامن کے ایک بہتر مقام معرکہ کے لئے تجویز کیا تھا بعض ارباب علم ایرانیوں کی تعداد ۱۰ لاکھ کے قریب تبلاتے ہیں جو ناقابل قبول ہے۔ مقدونیہ والوں کی تعداد ...۴۰ پیدل اور ...۷ سوار بتائی جاتی ہے جو اس سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس مرتبہ پھر ایرانیوں ہی کو شکست ہوئی جو افتاں و خیزاں اربیلہ یا اربیل پہونچے جو اب بھی اُسی قدیم ٹیلہ پر واقع ہے۔ ان کا تعاقب برابر ہوتا رہا یہاں تک کہ سکندر کو تکان کی وجہ سے مجبور ہو کر اربیلہ میں رُک جانا پڑا۔ دارا اور اُس کے باقیماندہ سپاہی بھاگ کر اکبتانہ (ہمدان) چلے آئے لیکن سکندر سارا مار کرتے بابل اور سوسا تک پہنچ گیا۔ اور ان دونوں نے بھی اسکی اطاعت قبول کر لی۔ پرسی پاس فتح ہو جانے کے بعد جلا کر

عراق کے آثار قدیمہ

حصہ دوم

اہل برطانیہ کو بابل کے آثار قدیمہ کی طرف توجہ دلانے کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ہوئی۔ چنانچہ اُس نے بصرہ کے رزیڈنٹ کو حکم دے کر وہاں کی اینٹوں کے نمونے لندن منگوائے۔ لیکن جس شخص نے اول اول بابل اور نینوی میں تحقیقات کی بنیاد ڈالی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا رزیڈنٹ متعینہ بغداد تھا جس نے ۱۸۲۱ء میں بعارضہ تخمہ شیراز میں انتقال کیا۔ اس کے بعد دیگر مشاہیر مثلاً کرپورٹر۔ فریزر۔ چزنی۔ رالن سن۔ لے یارڈ۔ جارج اسمتھ۔ رسام اور کنگ وغیرہم انھیں کے نقش قدم پر چلے۔

اہل جرمنی کی جانب سے تحقیقات کی ابتدا ۱۸۸۶ء میں بہ مقام سرغول اور الحبتہ ہوئی جو تلو سے بالکل نزدیک ہیں۔ لیکن کالڈیوی نے بابل کے ویرانوں کی کھدائی کی ابتدا ۱۸۹۹ء میں کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بنوخد نصر کے تعمیر کردہ شہر کا ایک حصہ برآمد ہوا۔

۱۸۸۱ء میں اہل امریکہ نفر آئے جہاں انھوں نے کھدائی کا کام نہایت جانفشانی سے شروع کیا اور اگرچہ درمیان میں اکثر رکاوٹیں پڑیں لیکن پھر بھی بہت درجہ کامیاب رہے لیکن جنگ کے چھڑتے ہی ان کا سب کام رک گیا۔

پچھلی نصف صدی میں حکومت ترکیہ کی بدولت عراق کی وہ حالت ہوگئی تھی کہ اہل سائنس و تفتیش کے کاموں میں بیحد دشواریاں پڑنے لگیں۔ چنانچہ اُن مقامات کے دیکھنے سے جہاں کسی زمانہ میں کھدائی کا کام ہو رہا تھا پتہ چلتا ہے کہ اُن بندگان خدا کو جن کی جان توڑ کوشش کی بدولت معلومات کا خزانہ زمانِ ماضی کے حالات کے سکوں سے مالا مال ہوگیا ہے اپنے مقصد کے حصول میں کیسی کیسی مصیبتیں جھیلنی اور کتنی مرتبہ ناکامی کی شکلیں دیکھنی پڑی ہیں جیسا کہ آیندہ کسی موقع پر مسٹر باٹا کے مصائب سے جو اُن کو خورس آباد کے [illegible]

مصیبتوں کا سامنا ہوا - ایک مرتبہ تو عربوں نے یہ غضب ڈھایا کہ اُن کے کیمپ میں آگ لگادی
جس سے نصف سے زیادہ تعداد میں اُن کے گھوڑے جل کر مر گئے - اور ایک ہزار ڈالر کے قریب
عربوں کے ہاتھ آئے - اسی وجہ سے عرصہ تک کھدائی کا کام ملتوی رہا لیکن غنیمت یہ
ہوا تھا کہ برآمد داشیا سب کی سب بچ گئی تھیں -

اگر ملک عراق کی قدیم یادگاروں کو محض سطحی نظروں سے دیکھا جائے تو بھی پتہ
چلے گا کہ مورخین علمائے آثار قدیمہ - سیاحوں اور مسافروں کے لئے قدیم اور دلچسپ
اشیاء کا کتنا زبردست ذخیرہ یہاں موجود ہے -

سید اطہر حسین جعفری یکم جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

نوٹ :- انھیں آثار قدیمہ کے تذکرہ میں بعض مقامات پر ایک قدیم رسم الخط کا ذکر
آیا ہے جسے انگریزی زبان میں Cuneiform فارسی میں میخی اور عربی میں
مسماری خط کہتے - اس کا نمونہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج کیا جاتا ہے -

ie DARIUS

D a r y v u sh.

داریوس یعنی ش و و ی ر ا د

ابو شہرین جس کا قدیم نام "اریدو" یعنی متبرک شہر ہے مقیر سے جنوب و مشرق کی طرف ۱۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ شہر انکی یا ایئی نامی دیوتا کے نام سے منسوب تھا۔ اس کے دو مندر، مینارہ ہیکل کو جو ٹیلہ کے شمال کی طرف واقع ہے ۱۸۵۴ء میں ٹیلر صاحب نے کھدایا تھا۔ اس شہر اور اس کے ہیکل کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ اس کے آثار کے آگے سنگی چبوترے بنے تھے اور ہیکل کے مینارہ کا زینہ چمکدار سنگ مرمر کا تھا۔

مسماری خط کے جو کتبے یہاں برامد ہوئے اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر سمندر کے ساحل پر واقع تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گو خلیج فارس کا پانی شہر کی عمارتوں کی دیواروں تک نہ پہونچتا ہو لیکن اس زمانہ کے مقابلہ میں وہ بلندی پر تھیں اور اُس کا اتصال خور سے رہا ہوگا۔

اسی بنا پر بیان کیا جاتا ہے کہ اب سے ۰۰۰۰ء سال پہلے ابو شہرین ایک بندرگاہ تھا۔ اس کے ٹیلہ کو جنگ عظیم کے زمانہ میں کپتان طامسن صاحب نے کھدایا تھا جہاں سے چاک کے ذریعہ سے بنائے ہوئے زرد رنگ کی مٹی کے برتن نکلے تھے جو بالکل اسی شکل کے تھے جیسے سُوسا کے خرابہ میں نیچے کی تہ سے برامد ہوئے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ سے قبل کے زمانہ میں ان دونوں شہروں کے باشندے ایک ہی قسم کے تھے۔

ابو حبہ۔ اس کے ٹیلے فرات سے ۲۰ میل پر اور محمودیہ کے جانب شمال اتنے ہی فاصلہ پر واقع ہیں۔ ۱۸۸۱-۸۲ء میں مسٹر رسام نے ان کو تلاش کر کے کھدایا تھا جس سے پتہ چلا کہ یہاں پر قدیم سپارہ (انجیلی نام سفروایم) (۵۰۰ء سال ق م) کے آثار مدفون ہیں۔ یہاں سے ۶۰۰۰ تختیوں کے علاوہ شمس (آفتاب کی دیوی) کا مندر بھی برامد ہوا اور نبونیدس کے تعمیر کردہ دو بھاری بھاری مجوف ستون بھی نکلے .... جو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ نبونیدس بابلستان کا ایک زبردست ماہر عالم آثار قدیمہ تھا جسکے ذریعہ سے مورخین زمانہ کو بیحد تاریخی امداد ملی ہے۔ ان ستونوں پر اس نے لکھا ہے کہ ہیکل شمس کے دوبارہ تعمیر کرنے سے پہلے ہمارے مزدوروں نے ابتدائی مندر کی بنیادیں کھودی ہیں تھیں کہ ان کو اس سے بھی پہلے کا یعنی نرم سین ابن سرگون اوّل کا رکھا ہوا سنگ بنیاد ملا جو ۳۲۰۰ سال تک کسی کو نظر نہ آیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ انھیں ستونوں کی بدولت معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ سے ۳۷۵۰ سال پہلے بابل میں نرم سین حکمران تھا۔

ابو حطب - (قدیم قسور آ ہ) - دیوانیہ سے تقریباً ۳۰ میل جانب جنوب مشرق بلو ترتیب اول شاہ اُور (۲۳۵۰ - ق - م) کے زمانہ کی اینٹوں اور اُور ثر) اور اسلین ہ کے خاندان والوں کی تختیوں کے مکتوبات کی بنا پر اس شہر کی مدت تعمیر ۲۴۰۰ سال (ق - م) کہی جا سکتی ہے۔ یہاں پر زمین کے اندر ایسے بڑے بڑے ظروف ملے جنمیں سے ایک کے اندر اس زمانہ میں لاش رکھی جاتی تھی اور دوسرا اُسکے اوپر رکھ کر منھ کو چونے سے بند کر دیا جاتا تھا۔

الجبتہ - تل یوح سے شمال مشرق کی طرف - یہاں سے اناطوم اور اناطوم اول اور گودیہ کے زمانہ کے کتبے برآمد ہوئے جس سے پتہ چلا کہ یہ شہر لاغاش کے زیر تصرف تھا۔

الاُحیمر - حلہ سے تقریباً ۹ میل شمال مشرق کی جانب - اغلب ہے کہ شہر قیس کا محل وقوع یہی ہو جسکے متعلق ۳۰۰۰ سال (ق - م) کے کتبے برآمد ہوئے ہیں - اُس زمانہ میں یہاں کا بادشاہ میسلم تھا جسکی فرمانروائی لاغاش نے اطاعت قبول کرلی تھی - یہاں سے شہر کے دیوتا نرامہ کے منار کی اینٹیں بھی برآمد ہوئی ہیں۔

بابل - یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے - یہاں کے اصلی باشندے اسے باب ایلی (خدائی دروازہ) کہتے تھے اس کا یونانی نام بابلن (Babylon) ہے - اس قدیم شہر کے خرابے دریائے فرات کے کنارے حلہ سے ۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہیں - یہ خرابے تین ٹیلوں پر مشتمل ہیں جنکے گرد ۱۸ کیلو میٹر کے قطر کی ایک دیوار بنی ہوئی تھی - ان کے نام علی الترتیب (جانب شمال) بابل (وسط میں قریۂ قویریش سے پورب طرف) قصر - (جانب جنوب) عمران ہیں۔

بابل کے ٹیلہ کو اہل عراق مُجلیبہ کہتے ہیں یہاں بنو خدنصر کے ایک محل اور قلعہ کے خرابے ہیں - اُس کی شمالی طرف والی پختہ دیوار پر ایک عبارت کندہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

شمالی جانب کی پختہ دیوار کے متعلق میرے دل میں خود بخود یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اسکے قریب بابل کی حفاظت کے لئے ایک محل تعمیر کرا دوں جو بالکل قدیم بابلن کے محل کے نمونہ کا ہو اور اس کی تعمیر اینٹ اور چونے سے ہو۔

قصر - بابل سے دکھن جانب واقع ہے - یہاں پر بنو خدنصر کا خاص محل - اور وہ شاہی سڑک ہے جو یہاں سے عمران تک مردوق کے مندر کے باب اِشتر تک تیار کرائی گئی تھی جسکے دونوں طرف مسلسل دیوار چلی گئی تھی - اس دیوار پر اب تک معمولی نیز افسانوی ([illegible]) جانوروں کی اُبھری ہوئی تصویریں بنی ہیں - جن کے اطراف میں نمایاں اور رنگ برنگ کی

مربع تختیاں پختہ مٹی کی جڑی ہوئی ہیں۔ سڑک کے درمیانی حصہ میں معمولی پتھر کی تختیاں جڑی
ہوئی ہیں جنکے اطراف میں سُرخ پتھر کے مربع تختے ہیں۔ ہر تختہ پر ایک عبارت منقوش تھی جس کا خلاصہ
یہ ہے "میں بابل کا فرمانروا بنوخد نصر ہوں۔ میں نے ہی شارع بابل پر حجر شادو کی تختیاں جڑوائی
ہیں تاکہ خدائے مردوق کا جلوس اُن پر سے گزرے۔ اے خدائے مردوق مجھے طول حیات عطا کر"
اس سڑک کے دونوں طرف ۵۰ شیر دو قطاروں میں بنے ہوئے تھے محل کے اندر جاکر دیکھئے تو وہ خاص
کمرہ بھی نظر آئے گا جس کے اندر سکندر اعظم مرا تھا۔ غالباً اسی مقام پر یا بقول دیگر تل عمران میں وہ
معلق باغ (Hanging Garden) تھا جو دُنیا کے سات عجائبات میں سے ایک شمار کیا جاتا تھا
یہ باغ ایک وسیع عمارت کی چھتوں پر لگایا گیا تھا۔ اس عالیشان عمارت کی ہر منزل کی چھت پر جو
ڈاٹوں پر قائم تھی کئی فٹ اونچی مٹی ڈالی گئی تھی جسمیں درخت نصب کئے گئے تھے۔ ہوا جو ان سرسبز
وشاداب درختوں پر سے گزر کر اندر آتی ہوگی یقیناً بہت ٹھنڈی ہوتی ہوگی۔ اور کیا عجب ہے کہ
اس محل کے اعمال گرمی کے موسم میں اس کے ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر اپنے اپنے فرائض انجام دیتے
ہوں۔ اس محل خاص کے شمالی مشرقی گوشہ میں ایک سنگی شیر بیٹھا ہوا ہے جو ایک آدمی کو دبائے ہوئے
ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ شیر سے مراد ہے بابل سے اور آدمی سے اشارہ ہے مصر کی جانب یعنی
اہل بابل نے کسی زمانہ میں مصر کو فتح کر کے اسی طرح کچل دیا تھا۔ تل نصر کے مشرقی ڈھال سے پورب
کی طرف کچھ فاصلہ پر 'حمیرہ' نامی ٹیلہ پر یونانیوں کا تعمیر کردہ ایک تھیٹر ہے۔ یہاں پر ایک تختی
برآمد ہوئی تھی جس پر یہ عبارت کندہ تھی "اس تھیٹر اور اسٹیج کو ڈیس کوریڈیس (Dioscurides)
نے تعمیر کرایا تھا"۔ اور غالباً سکندر ہی کے زمانہ کی تعمیر ہوگی۔

تل عمران۔ قصر سے شمال کی طرف نصف میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں پر اساگیلا
(Esagila) کا منارہ ہے۔ عمران کے شمالی ڈھال سے ۱۰۰ گز اُتر کی طرف قدیم زوطا
(منارہ ہیکل) ہے جس کی نسبت بعض کا خیال ہے کہ بابل کا منارہ یہی ہے۔ نابو پلاسر نے
اسکی مرمت کرائی تھی۔ چنانچہ اس کی اونچائی کی نسبت اُس کا قول تھا کہ میں نے ناف زمین پر
اس کی بنیاد مستحکم کردی ہے اور چوٹی آسمان تک بلند کردی ہے۔ بنو نصر نے بھی اسکی بلندی میں
اضافہ کیا تھا۔ کہتا ہے کہ میں نے اس امر کی کوشش کی کہ اسے اتنا بلند کردوں کہ آسمان سے باتیں
کرنے لگے۔ لیکن سکندر اعظم نے اسے بالکل ہی مسمار کرا دیا۔ اسکی شہر پناہ کے نشانات بابل کے قریب
شط النیل سے جنوب کی طرف قریہ ججمجہ تک پائے جاتے ہیں۔ بلاوات موصل سے ۱۵ میل

جانب شرق - یہ مقام ابھی تک اچھی طرح کھودا نہیں جا سکا - کیونکہ قرب وجوار کے لوگ یہاں
اپنے مُردے دفن کرتے ہیں - اسی وجہ سے کسی کو کھودنے کی اجازت نہیں دیتے - لیکن باوجود اسکے
رسام صاحب نے چند خوبصورت کانسہ کے مربع ٹکڑے برآمد کئے تھے جو شلم النصر ثانی کے بنا کردہ عالیشان
محل کے پھاٹک میں جڑے ہوئے تھے -

بادیان یہاں کی یادگاریں اور گنبد کی پتھر کی مورتیں (گو ان کے پاس تک پہونچنا دشوار ہے)
قابل دید ہیں - یہاں جو تصویریں پتھر پر بنی ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ سناچرب دیوی
اشتر کے سامنے کوئی نذر پیش کر رہا ہے - دوسری عبارت سے جو پتھر پر کندہ ہے بابل کی تباہی کا حال
معلوم ہوتا ہے جسکے باشندوں نے بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا جس نے اسکی پاداش میں
شہر کو مسمار کر دیا - یہیں پر ایک بڑا سا پتھر کا مربع تختہ ہے جسپر چار بڑی بڑی شکلیں بنی ہیں -
اس سے اوپر کی طرف ایک درجن کے قریب چھوٹے تختے بھی ہیں - بادیان عین سفنی سے ۵ میل کے
فاصلہ پر دریائے گومل کے کنارے آباد تھا - یہاں پر پتھر کی کانیں تھیں جہاں سے بُت اور دوسری
یادگاریں تراش تراش کر نینوا کو بھیجی جاتی تھیں - تیاری کے بعد بت چٹان سے کاٹ کر ٹھیلوں کے
ذریعہ سے دریا کے کنارہ تک لائے جاتے تھے جہاں سے کلک (بیڑے) پر لاد کر دریائی راستہ سے
نینوی کو روانہ کر دیے جاتے تھے - ان پتھر کے تختوں کی پشت پر متعدد گڑھے پائے جاتے ہیں جن میں
نینوی کی تباہی کے ایک ہزار سال بعد غالباً فقراء رہا کرتے تھے -

بسمایہ - (قدیم آدب یا اُدُن) دیوانیہ سے ۳۰ - ۴۰ میل جانب مشرق - سنہ ۱۹۰۳ء میں
شکاگو یونیورسٹی کی طرف سے کھدائی کا کام شروع ہوا تھا لیکن تکمیل کو نہ پہونچ سکا - بہترین نمونہ کی
ایک سنگی تصویر اسارہ - شاہ ادب کی برآمد ہوئی تھی جو غالباً ۳۰۰۰ سال قبل مسیح کی تھی -

برس نمرود - (قدیم برسپ یا برسیپا) حلہ سے ۹ میل جانب جنوب و مغرب - یہاں کے شاندار
نشانات کو لوگ عرصہ تک غلطی سے بابل کا منارہ سمجھا کئے - لیکن اصلیت یہ ہے کہ بنوخدنصر نے
شہر بارسپا کے وسط میں سبع سیارات کے مندر کے نام سے ایک عمارت بنوائی تھی جس کا زِقُّرات (منارہ)
ہیکل (زمانہ حال کے گرجے کی مینار کی طرح اب بھی ایک ٹیلہ کے اوپر آسمان سے باتیں کرتا ہے -
مندر کی منہدم دیوار ٹیلہ کی چوٹی پر ابتک باقی ہے اور اسکے اطراف کی جلی ہوئی اینٹوں اور چونہ سے
پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہاں زبردست آگ کا حادثہ ہوا ہوگا - مندر محافظ آسمان و زمین
خدائے نیبو ([illegible]) کے نام پر وقف کیا گیا تھا - اس کی عمارت ہفت منزلہ تھی - اور ہر

منزل ہر سیارہ کے رنگ کی مناسبت سے مختلف رنگ سے رنگی تھی مثلاً
پہلی منزل کا رنگ زحل کے رنگ پر سیاہ تھا۔
دوسری منزل کا رنگ مشتری کے رنگ پر نارنجی تھا۔
تیسری کا رنگ مریخ کے رنگ پر سرخ تھا۔
چوتھی منزل کا رنگ شمس کے رنگ پر سنہرا تھا
پانچویں کا رنگ زہرہ کے رنگ پر سفید مائل زرد تھا۔
چھٹی منزل کا رنگ عطارد کے رنگ پر نیلا تھا۔
ساتویں کا رنگ قمر کے رنگ پر سفید تھا۔

چھٹی منزل نیلا رنگ چڑھانے کے بعد رگڑ رگڑ کر چمکائی گئی تھی۔ اور اس پکے گہرے نیلے رنگ کا اثر ہے کہ یہ شاندار عمارت صدہا سال تک آب و ہوا کی دستبرد سے محفوظ رہ سکی۔

تل ابراہیم۔ بابل کے قریب ہی تل ابراہیم کے آثار قدیمہ ہیں۔ یہاں پر کسی زمانہ میں مُردوں کے دیوتا نرگل کی پرستش کی جاتی تھی۔ اُسکے ای مِسلم نامی مندر کو ونگی شاہِ اور نے از سرِ نو تعمیر کرایا تھا۔

تل اللحم۔ ناصریہ سے جانب جنوب مشرق ۲۰ میل کے فاصلہ پر ایک بہت قدیم ٹیلہ ہے جس کا قدیم نام اور جس کی قدامت ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔

تل لوح۔ (قدیم گرسو یا لاگاش) شط الحئی کے قریب شطرہ سے ۱۰ میل جانب شمال۔ اس ٹیلہ کا رقبہ تین مربع میل کے قریب ہوگا۔ سنہ ۱۸۷۷-۱۹۰۰ء میں ایم ڈی سرزک (M. de Sarzec) نے اور سنہ ۱۹۲۹ء میں کپتان گاسٹن کراس (Capt. Galon Cros.) نے اسے کھدوایا تھا۔ شمال مغرب سے جنوب مشرق کی سمت ایک قطار میں تین ٹیلے واقع ہیں۔ اوّل تل قصر۔ جہاں اوربابو (۲۵۰۰ ق۔م) میں گدیا نے تعمیر کرایا تھا یا یہ کہ اسکی تعمیر کی تجدید کرائی تھی۔ اس کا ایک پھاٹک اور مینار کا ایک حصہ امتداد زمانہ کے باوجود باقی ہے۔ گدیہ سے دو ہزار سال بعد عین اس مندر سے اوپر کی جانب اہل پارتھیہ کا ایک محل تعمیر ہوا تھا جسکی اینٹوں کے کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تعمیر کا زمانہ تقریباً ۱۳۰ سال (ق۔م) ہوگا۔ اسی مقام پر خزانہ کے کچھ سکے برآمد ہوئے جو ۳۰۰ ق۔م میں شط العرب کے قریب ایک بڑی بستی تھی۔

دوسرا یعنی وسطی ٹیلہ پہلے ٹیلہ سے ۳۰۰ گز کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسمیں تل لوح کی قدیم ترین عمارتیں شامل ہیں یہاں پر سطح زمین سے ۵ میٹر کی گہرائی میں مسیح سے تین ہزار سال قبل کی

ایک عمارت موجود تھی جس کی اینٹوں پر کاریگروں کے انگوٹھوں کے نشان موجود تھے اسی ٹیلہ کے حدود میں ایک بلند مقام پر شاہ اُور نینا کا مال گدام بھی موجود ہے اسکی اینٹیں پختہ ہیں اور شکل میں مستطیل اور محدب ہیں جنکے ایک سمت انگوٹھوں کے نشانات ہیں۔ عمارت کے بیرونی جانب خشتی ستون بنے ہیں جنمیں سے بعض کے اوپر صنوبر کی لکڑی کے ستون کے نشانات ابتک باقی ہیں۔ اسکے جنوبی سمت میں ایک حوض ہے جس پر چونے کا پلاسٹر کیا ہوا ہے۔ اور اس سے جنوب مشرق کی طرف تھوڑے فاصلہ پر دو تالاب نما حوض بنے ہیں جو غالباً کھجوروں کا شیرہ ٹپکانے یا کھجور کی شراب کشید کرنے کی غرض سے بنائے گئے ہوں گے۔ تیسرا ٹیلہ دوسرے ٹیلہ سے ۲۰۰ گز کے فاصلہ پر واقع ہے اس کا نام تل الواح ہے۔ اسمیں سے بیشمار پختہ مٹی کی تختیاں برامد ہوئیں جنھیں عہد اور ہیکل کی دستاویزیں اور اخراجات کے رجسٹر سمجھنا چاہیے۔

تل نینوی۔ یہاں کے خرابے موجودہ شہر موصل کے مقابل دریائے دجلہ کے مشرقی کنارہ پر واقع ہیں قدیم شہر نینوی اُسی مقام پر تھا جہاں قیونجق اور نبی یونسؑ کے ٹیلے واقع ہیں۔ اس شہر کے گرد چار میل لمبی اور ۲ میل چوڑی شہر پناہ تھی۔ وہ پل جو اب موصل میں دجلہ پر بنا ہے اسی شہر پناہ کے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ قیونجق سے بیشمار تختیاں اشور بنی پال کے زمانہ کی برامد ہوئیں جو مختلف مضامین پر مشتمل تھیں۔ اور جنھیں اس بادشاہ کا کتبخانہ سمجھنا چاہیے۔ ان کی عبارت کو جارج اسمتھ نے بڑی عرق ریزی کے بعد پڑھا تھا۔ ایک اور خوبصورت تختی نکلی جسپر کچھ تصویریں کندہ تھیں۔ انھیں کے بغل میں ایک عبارت بھی تھی جسمیں شاہ سناچریب کے لاکش کے مال غنیمت کے ملاحظہ کا حال درج تھا انھیں تختیوں کی بدولت خلقت۔ ہبوط آدمؑ اور طوفان نوحؑ کے بارہ میں کلدانیوں کے اعتقادات کا حال بھی معلوم ہوا۔ انھیں ٹیلوں سے ایک سناچریب کے اور دوسرے اس کے پوتے اشور بنی پال کے محل کے نشانات بھی برامد ہوئے۔ ان کے علاوہ سنگ مرمر کے بت چونے کی تصویریں۔ ستون اور بہت سی چیزیں نکلی تھیں۔

تل نبی یونسؑ یہاں پر اب ایک مسجد اور حضرت یونسؑ کا مزار ہے۔ اور اسی کے اردگرد مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی بستی قریۃ النینوی کے نام آباد ہے۔ متبرک مقام ہونے کی وجہ سے کسی کو آزادی کے ساتھ ٹیلہ کو کھدانے کی اجازت نہیں مل سکی لیکن پھر بھی بعض سرہنری لیارڈ ایسے شخصوں نے کچھ نہ کچھ چیزیں اپنی تدبیروں سے برامد ہی کرلیں۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں انھیں مقامات پر والئی موصل کو دو سنگی بیل اور ایک سنگ مرمر کا تختہ زمین کے اندر

ملا تھا - پرندوں کی طرح سے بیلوں کے دو دو بازو تھے - یہ تختہ ۱۸۷۷ء تک قسطنطنیہ کے عجائب خانہ میں موجود تھا - اس کے بعد یکایک غائب ہوگیا اور کئی سال کے بعد جزائر برطانیہ میں نمودار ہوا -

تل نمرود - تیو نجق سے چند میل جانب جنوب واقع ہے - یہاں سے اہل اسیریہ کی بہترین یادگاریں برآمد ہوئیں - مثلاً شلم النصر کا بنوایا ہوا ۷ فٹ بلند سنگ موسیٰ کا ستون جس پر بادشاہ کے جیہو ابن اُومری سے خراج لینے کا حال مندرج ہے - اسی شہر قالہ سے جس کا ذکر انجیل میں ہے لے یارڈ صاحب نے ایک نفیس سنگ مرمر کا بیل - ایک ذوالجناحین شیر - اور چند تصویریں گچ کی برآمد کرکے لندن بھیجی تھیں - ان کے علاوہ اور بہت سی تصویریں پھر بدستور سابق اسی مقام پہ دفن کردی گئیں - بعض سنگ مرمر شیشے اور گچ کی یادگاروں پر سرغون ثانی (۷۲۲-۷۰۵ ق-م) اشورنبی پال (۸۸۵-۸۶۰ ق-م) - شلم النصر ثانی اور اسرحدان (۶۸۱-۶۶۸ ق م) کے نام درج تھے -

تل مقیر - ناصریہ سے دکھن پچھم کی طرف ۷ میل کے فاصلہ پر اُور کی یادگار ہے - یہاں کے خرابے حضرت مسیح سے تقریباً ۲۷۰۰ قبل کے ہیں - یہاں سے برآمد شدہ کتبوں میں سے ایک پر شاہ بابل بلشضر کا نام درج تھا -

نفر - بابل کے زمانہ کا پامپے آئی (Pompeii) کہا جاتا ہے - یہ شہر شطرہ سے اُتر اور پورب کی طرف ۸ میل اور شط الحئی سے دکھن جانب ۳ میل کے فاصلہ پر واقع ہے - اسکے خصوصیات میں سے چند یہ ہیں - ایک خاص قسم کے پتھر کے متعدد مجسمے برآمد ہوئے - یہاں پر اس محل کا نشان ہے جو بابل کی ایک مقدس عمارت کو کھود کر اہل پارتھیا کے لئے تعمیر ہوا تھا - بعض ایسی چیزیں برآمد ہوئیں جن کی قدامت (۳،۵۰۰ سال ق-م) کہی جاتی ہے - کسی عمارت کے ایک لمبے طاق پر رکھی ہوئی ۳۰۰۰ کے قریب پختہ مٹی کی تختیاں برآمد ہوئیں جنھیں غالباً کسی کلیسیا کے کاغذات (Records) کہا جا سکتا ہے - ایک تختی پر ڈنگی نامی بادشاہ کا حال مندرج تھا جس کو شاہ اور یا دُنیا کے چاروں حصہ کا فرمانروا کہا جاتا تھا - کیا عجب ہے کہ ایسے ہی بادشاہ یا اس کے کسی مورخ نے عراق کے طوفان کو کل روئے زمین کا طوفان قرار دیدیا ہو -

جرابلس - یہ وہ مقام ہے جہاں حطیطیوں کے (جنھوں نے سیریا میں سنہ ۱۱۰۰ ق-م سے

۶۰۵ ق۔م تک حکومت کی) کے شہر کارشمیس کے آثار کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یورپ یا
ایک اور قدیم اور مشہور رومی شہر کے آثار حطیطوں کے دو شہروں کے کھنڈرات کے گرد پھیلے
ہوئے ہیں یہاں پر جسکو صحن عراق کہنا بجا ہوگا اول بابلونیا ملتا ہے۔ وہ صنعت جس کا نمونہ
برطانوی علمائے آثار قدیمہ کی برآمد کی ہوئی شاندار یادگاروں میں پایا جاتا ہے حطیطوں
نے بابل والوں سے حاصل کی تھی۔ کارشمیس کی دیوی وہی ہے جسے اہل بابل اشتر کہا کرتے تھے
حطیطوں کی چند سنگی تصویریں جو ابتک اچھی حالت میں ہیں۔ اُن کی کمروں میں پٹکے (کمر بند) کا
نشان بنا ہوا ہے جو بالکل اُسی شکل کا جیسا اس زمانہ کے شرفائے عراق استعمال کرتے ہیں

حمام۔ دیوانیہ سے تخمیناً ۴۰ - ۵۴ میل جانب جنوب مشرق۔ یہاں پر ایک نہایت قدیم
مستطیل شکل کی پختہ اینٹوں کی عمارت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ جو ٹیلہ سے ۱۲ میٹر کے قریب
بلند ہیں۔ یہاں پر کھدائی کا کام ابھی تک نہیں ہوا۔

خرس آباد۔ اس نام کا عجیب وغریب منہدم شہر موصل سے شمال مشرق جانب ۱۴ میل
کے فاصلے پر دریائے خوسر کے بائیں کنارہ پر واقع ہے جو نینوی تک پہونچکر دجلہ میں گرتا ہے
یہاں پر دُور شرقین (قصر سرغون) کے جسکو سرغون ثانی یعنی سناخریب کے والد نے تعمیر کرایا تھا۔
آثار موجود ہیں۔ عمارت کی دیواروں پر نیلے اور سفید رنگ کے چمکدار پختہ مٹی کے ٹکڑوں سے
بیل بوٹے بنے ہیں۔ بڑے بڑے کمروں کی دیواروں پر اُبھری ہوئی مختلف قسم کی تصویریں بنی ہیں
ان کے دروازے بھی بہت خوبصورت ہیں۔ اہل فرانس نے یہاں کھدوایا جنکو ایک گوشہ پر
پتھر کا ایک صندوق ملا جسپر کچھ نقوش کندہ تھے۔ اسکے اندر سونے۔ چاندی۔ تانبے۔ سیسے
وغیرہ کی تختیاں ملیں جن پر مختلف عمارتوں کے تعمیر کے مختصر حالات درج ہیں۔

جسوقت مسٹر باٹے (Mr. Botta) ان ٹیلوں کو کھدوا رہے تھے ان کو زر کثیر صرف
کرکے لکڑی کی بلیاں منگانی پڑیں تاکہ اُن کی آڑ سے مدفون شہر کی دیواروں کو قائم رکھا
لیکن افسوس ہے کہ قرب وجوار کے قریوں کے عرب باشندے سب کی سب ایک ایک کرکے چرا لے
جس کی وجہ سے دیواریں گر گئیں۔ ترکی گورنر کا خیال تھا کہ باٹے صاحب سونا نکالنے کی فکر
ہیں چنانچہ اُس نے وہاں پر پہرہ لگا دیا۔ اور جب آخر میں سونا نہ نکلا تو باٹے صاحب کے آد
کو قید کرکے اسپر بھی اکتفا نہیں کی۔ کھدائی کے کام کو یکلخت بند کرا دینے کی فکر کی یعنی قسطنطنیہ

اطلاع بھیجی کہ باٹے صاحب ایک قلعہ تعمیر کرانا چاہتے ہیں تاکہ ملک عراق کو بزور شمشیر فتح کر کے خود سلطان بن بیٹھیں۔ اسپر بھی مصیبت کا خاتمہ نہیں ہوا۔ بہت سے عجائب روزگار جو خرس آباد سے برآمد ہوئے تھے مع ساٹھ عدد صندوقوں کے جنمیں آشور بنی پال کے محل واقع قیونجق سے برآمد شدہ چونے کی تصویریں تھیں کشتی کے ذریعہ سے دوسرے مقام پر منتقل کئے جاتے ہوئے غرق دریا کردیئے گئے اسکے علاوہ سارا سامان جو اوپرٹ صاحب (M. Oppert) نے بابل میں خود کھود کر نکالا تھا یا یہ کہ مول لیا تھا مع عہد نرم سین کی قیمتی سنگ مرمر کی چھوٹی سی کشتی کے بصرے جاتے ہوئے قرنا کے قریب ڈبو دیا گیا۔

دیر۔ ابوحبہ سے شمال مغرب ۲۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور غالباً بغداد سے ۱۸ میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ ڈاکٹر ولیس بج نے اسے سنہ ۱۸۹۱ء میں کھدوایا تھا۔ اس مقام پر ہزاروں کی تعداد میں تختیاں برآمد ہوئیں جو بابل کے قدیم بادشاہوں کے زمانہ کی تھیں۔

سنقرہ (قدیم لارسا) ورقہ سے ۱۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کے ایک حصہ کو گزشتہ صدی کے وسط میں مسٹر لوفٹس نے اس خرابہ کو کھدایا تھا۔ اُن اینٹوں کے نقوش سے جو یہاں پر برآمد ہوئیں پتہ چلا کہ سنہ ۲۲۰۰ (ق۔م) میں اور انگور نے اسی مقام پر ببّر (خدائے شمس) کے ہیکل کو از سر نو تعمیر کرایا تھا۔ اسکے بعد اسکی تعمیر پھر سنہ ۲۲۵۰ ق۔م میں ہمّو رابی کے بیٹے سمسو ایلونا کے عہد میں از سر نو ہوئی۔ تل سفر سے ایک تختی برآمد ہوئی تھی جس سے پتہ چلا تھا کہ شاہ لارسا ریم سین نے شہر اسین کو سنہ ۲۰۰۰ ق۔م میں فتح کیا تھا۔ اسی مقام سے کچھ ایسی تختیاں اور برآمد ہوئیں جو مٹی کے سبک لفافوں میں بند تھیں بعض مثلثی شکل کی تھیں جنکے ہر ہر گوشہ پر ایک ایک سوراخ تھا جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے لیبل کے طور پر استعمال کی جاتی رہی ہوں گی۔ ایک تختی پر دو آدمی بنے تھے جو آپسمیں مشت زنی (گھونسہ بازی) کر رہے تھے جس سے معلوم ہوا کہ ۴۰۰۰ سال پیشتر بھی اس کا رواج تھا۔

سرغول۔ تل لوح سے تقریباً ۱۰ میل کے فاصلہ پر۔ ڈاکٹر کالڈیوی نے اسے سنہ ۱۸۸۷ء میں کھدایا تھا۔ گودیہ کا ایک کتبہ یہاں پر ملا جس سے معلوم ہوا کہ یہ لاغاش (تل لوح) سے ملا ہوا تھا۔ اسکے علاوہ چند قبریں بھی برآمد ہوئیں جو بہت قدیم نہ تھیں۔ غالباً یہ شہر اس زمانہ میں آگ سے جلکر خاک سیاہ ہوگیا تھا جب لاغاش کا شہر اجڑا تھا۔

شرقات - یا قلعہ الشرقات بغداد اور موصل کے درمیان دجلہ کے مغربی کنارہ پر واقع ہے۔
یہاں پر اہل اسیریا کے خرابے مدفون ہیں اسی مقام پر کھدائی کے بعد اسیریا کے اس قدیم ترین
پایہ تخت کا پتہ چلا جس کو ام البلاد کہا جاتا تھا۔ موصل سے بغداد کی طرف آتے ہوئے ریل متعدد
ایسے مقامات کے قریب سے گزرتی ہے جہاں پر اسیریا کے آثار قدیم مدفون ہیں حتیٰ کہ گوگمیلا کے
میدان میں داخل ہوتی ہے جہاں ۳۳۱ء ق۔م میں اسکندر اعظم اور داریوس کے درمیان
جنگ ہوئی تھی جسمیں سکندر فتحیاب ہوا تھا۔

شوش (قدیم سوسا) ششتر Shushtar سے تخمیناً ۱۵ میل جانب شمال مغرب۔
یہاں پر ایک قلعہ تھا جو ۶۰۰۰ء ق۔م میں ایک چھوٹے قلعہ کی شکل میں تھا اس ٹیلہ کا رقبہ
۴۵۰ × ۲۵۰ میٹر ہے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قبل تاریخ سے لیکر یونانی۔ ایرانی شاہوں کے
عہد تک یہ شہر مسلسل طور پر آباد رہا۔ اسی کے قریب شاہی شہر بھی تھا جس میں اُن بادشاہوں
کے محلات تھے جو داریوس کے زمانہ کے بعد ہوئے تھے۔ یہ آبادی قلعہ بزرگ کے جنوب مشرق
سے شمال مشرق طرف ۱۵۰۰ میٹر کے دور میں پھیلی تھی۔ اسی سے ملحق تُجار کا محلہ تھا جسکے
قریب ہی دریائے کرخہ کے داہنے امارہ والا محلہ تھا۔

طاق کسریٰ - بغداد سے جانب جنوب ۱۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسکی صرف
ایک محراب باقی رہ گئی ہے اسکو خسرو ثانی نے جس کا زمانۂ حکومت ۵۹۱ء سے ۶۲۸ء ہے تعمیر کرایا تھا۔
لفظ کسریٰ فارسی لفظ خسرو کا معرب ہے اسلئے یہ دونوں لفظ ایک ہی ذات پر دلالت کرتے ہیں
شاہ مذکور ایرانی ساسانی خاندان کا آخری مگر سب سے زبردست فرمانروا تھا۔ محراب مذکور
۱۲۰ فٹ اونچی - ۱۶۴ فٹ لمبی اور ۸۲ فٹ چوڑی ہے جس زمانہ میں برطانوی فوج بغداد کی
جانب گولہ باری کر رہی تھی ہزاروں سپاہیوں نے اس عظیم الشان محراب کے سایہ میں دھوپ سے
پناہ لی تھی۔ اسی طاق کسریٰ یا قطیسفان کے متعلق میرا مبسوط مضمون کسی زمانہ میں مجلہ
"ادب" لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے۔ **عقرقوف** عراق کے جملہ خرابوں میں انتہا درجہ عجیب و غریب
ہے۔ بغداد سے پچھم کی طرف تقریباً ۱۵ میل کے فاصلہ پر فلوجہ کی قدیم شاہراہ کے قریب واقع ہے
ملکہ الیزبتھ کے زمانہ تک مغربی سیاح غلطی سے اسکو بابل کا منارہ سمجھتے تھے۔ اسکو قوری قلزو
شاہ بابل نے اس زمانہ میں تعمیر کرایا تھا جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصر سے باہر لیجا رہے تھے۔

آثار اس کا پتہ دیتے ہیں کہ یہاں پر ایک منارہ تھا جو غالباً دو غرضوں سے بنایا گیا تھا۔ ایک تو مذہبی نقطۂ خیال سے مقدس منارہ کے طور پر اور دوسرے رسدگاہ کا کام دینے کے لئے۔

اصل منارہ کا درمیانی حصہ ۱۰۰ فیٹ سے بھی بلند ہے اور پختہ اینٹوں سے اس طور سے تعمیر ہوا ہے کہ ہر ۵ یا ۷ اینٹوں کی اونچائی کے بعد نرکٹ کی چٹائیوں کی تہ دی ہوئی ہے۔ اور ایک تہ سے دوسری کا فاصلہ تخمیناً ۳ فٹ ہے۔ پختہ اینٹیں باہر کی طرف لگی ہوئی تھیں جواب بوسیدہ ہو کر غائب ہوگئی ہیں۔ لیکن منارہ کی بنیاد کے قریب اب بھی انکے چھوٹے ٹکڑے نظر آتے ہیں۔

اسی سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کے عراق کے باشندے زمانۂ حال کے عربوں اور ترکوں سے کہیں زیادہ مہذب تھے۔ علم نجوم میں انھیں مہارت کامل حاصل تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کھدائی کے موقع پر دوربین کے صاف و شفاف شیشے برامد ہوئے تھے۔ اسکے علاوہ کچھ کتبے بھی دستیاب ہوئے جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علم کے مطابق مشتری میں چار چاند تھے۔ بارہ برجوں کے نام بھی انھوں نے الگ الگ رکھے تھے قطبین کو ۳۶۰ درجوں میں تقسیم کیا تھا۔ اور ہر درجہ کو ۶۰ دقیقہ میں اور ہر دقیقہ کو ۶۰ ثانیہ میں۔ غالباً دن اور رات کے تقسیم کا طریقہ جیسا کہ زمانۂ حال کی گھڑی کے ڈائل پر نظر آتا ہے انھیں کا ایجاد کردہ ہے۔

عنبر۔ فلوجہ کے نزدیک جہاں پر نہر عیسیٰ جو کسی زمانہ میں عقرقوف کی پشت سے ہوتی ہوئی دجلہ تک جارہی تھی آکر فرات سے ملتی ہے عنبر اور سفیرہ کے بڑے بڑے ٹیلے واقع ہیں۔ یہاں پر اس زمانہ میں جبکہ صدیوں تک فلوجہ دنیا کے خشکی کے راستوں کا مرکز تھا انھیں ناموں کے دو بڑے مشہور شہر آباد تھے۔

نفر۔ یہاں کے ٹیلے تقریباً اسی درجہ کے ہیں جس درجہ کے بابل کے ٹیلے اور آفج کے دلدل کے بالکل کنارہ پر واقع ہیں۔ پنسلوینیا یونیورسٹی نے ان کو کھدا کر بہت سی چیزیں برامد کی تھیں۔ لے یارڈ صاحب کا خیال تھا کہ یہاں پر کچھ بھی نہیں ہے لیکن ۵۰ سال بعد پروفیسر ہلپرٹ نے اعلان کیا کہ ان کو یہاں سے ۶۰۰۰۰ تختیاں دستیاب ہوئیں۔ ان کے علاوہ ایک مندر اور کتبخانہ کا نشان بھی ملا۔ اور سرگون سے بھی پہلے کا ایک دروازہ برامد ہوا جو ریگستان کی سطح کے نشیب میں دفن تھا۔

نصیبین۔ کلیسیائی تاریخ میں ایک مشہور مقام ہے۔ جو دو سو سال تک اہل روم کا سرحدی

قلعہ رہ چکا ہے۔ لیکن جب جودین مالک ہوا تو اُس نے ۶ امیل کے فاصلہ پر دارا شہر آباد کیا جہاں پر اس قدیم رومی شہر کے کھنڈرات دور تک نظر آتے ہیں نصیبین کا شہر پہاڑیوں کے دامن میں میدان کے کنارے پر ایک نہایت ہی موزوں جگہ پر آباد تھا۔ سلیم (معروف بہ غضبان) کے زمانہ تک یہ شہر گلزار تھا اور چونکہ یورپ اور ایشیا کے درمیان اکثر سڑکیں اسی سے ہو کر گزرتی تھیں اس لئے یہ تجارتی مرکز بھی بن گیا تھا۔

نھروان۔ اس نام کی ایک طویل نہر سامرہ کے شمال دجلہ سے نکل کر دیالہ تک آتی ہے۔ اور یہاں سے آگے بڑھکر کُوت کے قریب پھر دجلہ سے مل جاتی ہے۔ بابل کی سب سے بڑی نہر شط النیل تھی جو بابل کے شمال سے نکل کر نفر ہوتی ہوئی ناصریہ کے قریب شط الحی سے آکر مل جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ ارض کلدان میں پہونچکر اسکو دریائے چبار کے نام سے پکارا جاتا تھا جسکے پانی سے نشیبی عراق کے میدان میں صدیوں تک آبپاشی ہوا کی ہے۔ نہروان کے قریب دجلہ کے کنارے دو مشہور قصبے تکریت اور سامرہ آباد ہیں۔ تکریت میں جو کسی زمانہ میں عیسائی پادریوں کا صدر مقام تھا اور جہاں پر لشکر یزید نے امام حسینؑ کے سر کو دمشق لے جاتے ہوئے ایک شب قیام کیا تھا چند قدیم کھنڈرات باقی ہیں۔ سامرہ کی آبادی سے قریب ہی اسکے لبغداد کے کھنڈرات کے درمیان ایک بلند منارہ اب بھی نظر آتا ہے جو کسی زمانہ میں غالباً رصد گاہ رہا ہوگا۔ زمانہ حال کے ایک عالم فن مساحت کرنل بیزلی نے دریافت کیا ہے کہ یہاں پر کسی زمانہ میں زیر زمین آبپاشی کی نالیوں کا ایک زبردست جال تھا۔

ورقہ۔ عراق دو خاص حصوں میں منقسم ہے۔ جنوبی حصہ جو سُمیر یا ارض شنار کے نام سے مشہور ہے شمالی حصہ جو عقاد کہلاتا ہے۔ ارض شنار میں سفر کرنے والے کو چپہ چپہ پر بڑے بڑے خرابے ملیں گے اور چھوٹے خرابوں کا تو شمار ہی نہیں ہے۔ بڑے خرابے سوق الشیوخ سے ۶۰ میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ورقہ کی یادگار ہیں جس کا نام انجیل میں ارک درج ہے۔ کسی زمانہ میں ان ٹیلوں سے متعدد عجیب و غریب تابوت برامد ہوئے۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ باہر لاتے لاتے پاش پاش ہو جاتے تھے۔ چنانچہ فوراً ہی یہ تدبیر کی گئی کہ روشنی میں لانے کے ساتھ ہی اُن کے اوپر کاغذ چپکا دیا جاتا تھا اس کے